دِیا جلے ساری رات

خواجہ احمد عباس

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

دیا جلے ساری رات

دِیا جلے ساری رات

خواجہ احمد عباس

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

Diya Jale Sari Raat
by
Khwaja Ahmad Abbas
Rs.58/-

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 ☎ 011-26987295
Email: monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔110006 ☎ 011-23260668
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔400003 ☎ 022-23774857
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔202002 ☎ 0571-2706142
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 ☎ 011-26987295

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ہیں

سنہ اشاعت: 2011 تعداد: 1100 قیمت: -/58روپے
ISBN: 978-81-7587-507-4 سلسلۂ مطبوعات: 1413

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025
فون نمبر: 49539000 فیکس: 49539099
ای میل: urducouncil@gmil.com ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس آفسیٹ پرنٹرز، C-7/5 لارینس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی۔110035
اس کتاب کی چھپائی میں 70 GSM TNPL Maplitho کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔

معروضات

قارئین کرام! آپ جانتے ہیں کہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جو اپنے ماضی کی شاندار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ 1922ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا جو زمانے کے سرد و گرم سے گزرتا ہوا آگے کی جانب گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں، نامساعد حالات سے بھی سابقہ پڑا مگر سفر جاری رہا اور اشاعتوں کا سلسلہ کلّی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

اس ادارے نے اردو زبان و ادب کے معتبر و مستند مصنّفین کی سیکڑوں کتابیں شائع کی ہیں۔ بچوں کے لیے کم قیمت کتابوں کی اشاعت اور طلبا کے لیے ''درسی کتب'' اور ''معیاری سیریز'' کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی تیاری بھی اس ادارے کے مفید اور مقبول منصوبے رہے ہیں۔ ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ تعطل پیدا ہوگیا تھا جس کی وجہ سے فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کمیاب بلکہ نایاب ہوتی جارہی تھیں شائع ہوچکی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اب تمام کتابیں مکتبہ کی دلّی، ممبئی اور علی گڑھ شاخوں پر دستیاب ہیں اور آپ کے مطالبہ پر بھی روانہ کی جائیں گی۔

اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور مکتبہ کی ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیئر مین اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر جناب نجیب جنگ (آئی اے ایس) کی خصوصی دلچسپی کا ذکر ناگزیر ہے۔ موصوف نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے فعّال ڈائرکٹر جناب حمید اللہ بھٹ کے ساتھ (مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے درمیان) ایک معاہدے کے تحت کتابوں کی اشاعت کے معطّل شدہ عمل کو نئی زندگی بخشی ہے۔ اس سرگرم عملی اقدام کے لیے مکتبہ جامعہ کی جانب سے میں ان صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ یہ تعاون آئندہ بھی شاملِ حال رہے گا۔

خالد محمود

منیجنگ ڈائرکٹر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

کرشن چندر اور احمد عباس کا آپس کا "مقدمہ" از کرشن چندر ۔

۱۔ دیا جلے ساری رات

۲۔ روپے آنے پائی

۳۔ چراغ تلے اندھیرا

۴۔ بچوں کا خط مہاتما گاندھی کے نام

۵۔ کچی پکی

۶۔ تین تصویریں

۷۔ ڈیڈ لیٹر

۸۔ الف لیلہ ۱۹۵۶

۹۔ بھارت ماتا کے پانچ روپ

کرشن چندر اور احمد عبّاس کا آپس کا "مقدمہ"

کرشن : تاریخ پیدائش یاد ہے؟ میرا مطلب ادبی تاریخِ پیدائش سے ہے۔
عبّاس : یوں تو میں اپنے پیدا ہونے سے بہت پہلے پیدا ہو گیا تھا۔
کرشن : کیسے؟
عبّاس : میرا مطلب ادب تعلیم اور کلچر کے ورثے سے ہے۔ جو میرے پیدا ہونے سے پہلے میرے گھر میں تھا۔ میں نے حالی کی شاعری میں پرورش پائی۔ کتابوں اور رسالوں میں پلا اور بڑھا۔ تم مجھے صحیح معنوں میں "کتابوں کا کیڑا" کہہ سکتے ہو۔ ننہال حالی کا خاندان تھا۔ چچا خواجہ غلام الثقلین، وکیل، سیاست اور ادب کے رسیا۔ حالی کے بیٹے خواجہ سجاد حسین علی گڑھ یونیورسٹی کے پہلے مسلم گریجویٹ میرے نانا تھے۔ گھر کی عورتیں تہذیبِ نسواں میں مضامین لکھتی تھیں۔ اس ادبی ورثے کو لے کر.....
کرشن : مگر سب کچھ ورثہ ہی تو نہیں ہے۔ آدمی سب کچھ ورثے ہی سے تو نہیں

بنتا ہے اس کے ارتقا میں بہت سے عناصر کام کرتے ہیں۔ مجھی کو دیکھ لو۔ باپ ڈاکٹر، گھر آریہ سماجی۔ لیکچر جھاڑنے کے بڑے شوقین۔ ماں کنوارپنے میں شاعری کیا کرتی تھیں۔ لوک گیت قسم کی چیزیں کہا کرتی تھیں اور میں جب اسکول میں پڑھا کرتا تھا، انھوں نے مجھے اپنے گیتوں کا ایک قلمی مسودہ دکھایا تھا۔ جو ممکن ہے انھوں نے اب تک سنبھال کر رکھا ہو۔ مگر اس کے باوجود ہمارے گھر کا ماحول بالکل ادبی نہیں تھا۔ جانے شادی کے بعد میری ماں جی کو ایسی کتابوں سے چڑھ کیوں ہو گئی تھی جنھیں لوگ ادبی کہتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے پہلی ادبی کتاب جو میں نے پڑھی وہ "الف لیلہ" تھی۔ ماں جی نے اسے پھاڑ کر باہر پھینک دیا۔ دوسری کتاب "پریم چند کی "پریم پچیسی" تھی۔ ماں جی نے اس سے بھی یہی سلوک کیا۔ میرے دوستوں میں بھی کسی کو پڑھنے لکھنے کا شوق نہیں تھا۔ مجھے خود بچپنے میں پہلوانی کا بہت شوق تھا۔

عباس: پہلوانی کا تو نہیں لیکن دوسرے کھیلوں کا مجھے بھی بہت شوق تھا۔ فٹ بال، ہاکی، کرکٹ، ٹینس، سب گیم میں نے کھیلے۔ لیکن کسی میں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اس چیز کا مجھے بہت ملال رہا۔ عرصے تک یہ بات دل میں کھٹکتی رہی۔ کیوں کہ میں ایک اعلیٰ اسپورٹس مین بننا چاہتا تھا لیکن نہ بن سکا۔ در اصل میرا چھوٹا قد، اور میری مشکوک صحت (مجھے ہمیشہ نزلے کی شکایت رہی ہے) میرے اندر ایک قسم کا احساسِ کمتری پیدا کرنے کا باعث بنے۔ اور میں نے سوچا اگر میں کھیلوں کے میدان میں کامیابی حاصل

نہیں کرسکتا تو مجھے کسی دوسرے شعبے میں کامیابی حاصل کرنا چاہیے۔ پھر میں نے دیکھا کہ جو لوگ اچھا بول لیتے ہیں۔ اچھی بحث کر لیتے ہیں۔ اُن کی بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے۔ اسکول کی بحثوں میں، کالج اور یونیورسٹی کے مقابلوں میں، میں نے فن تقریر میں بہت کامیابی حاصل کی۔ اور تم جانتے ہو۔ اچھی تقریر کا اچھی تحریر سے کتنا گہرا تعلق ہے۔ ۔ یہی احساس مجھے ادب کے میدان میں کھینچ لایا۔ کئی بار سوچا ہوں اگر میں کھیلوں کے میدان میں کامیاب ہو جاتا تو ہزارے یا مرچنٹ کی طرح ایک کامیاب کھلاڑی ہوتا۔

کرشن : اور میں ایک مشہور پہلوان ہوتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر میں اس عمل کو تمھارے یا اپنے احساسِ کمتری سے منسوب نہیں کروں گا۔ قد تو میرا ابھی چھوٹا ہے اور نزلے کی شکایت مجھے بھی رہتی ہے۔ مگر ادب میں آنے کا یہی سبب نہیں ہوسکتا۔ ۔ میں اس کی تاویل یوں کرنا چاہتا ہوں کہ جب انسان کی جسمانی اور ذہنی اور روحانی ترقی کسی ایک سمت یا نہج یا جانب سے رُک جاتی ہے۔ اور مزید کوشش کے باوجود اس سمت آگے بڑھنے کا اسے کوئی راستہ نہیں ملتا تو انسان حزیمت گوارا نہیں کرتا۔ انسان اپنی ترقی کے دوسرے رستے نکالتا ہے۔ کیوں کہ ارتقا انسان کی شعوری فطرت کا خاصہ ہے۔

عباس : ہاں اس کی فلسفیانہ تاویل یوں کی جاسکتی ہے۔

کرشن : مگر میرا وہ پہلا سوال تو بیچ میں رہ گیا۔ تم ادب میں کب داخل ہوئے۔

عباس : ۱۹۳۵ میں بمبئی میں ایک کہانی لکھی تھی : ابابیل ، اور جسے کہتے ہیں نا
کہ ایک رات میں مشہور ہو جانا ۔ بس یوں سمجھو کہ میں ایک کہانی لکھ کر
مشہور ہو گیا ۔ اس کا ترجمہ دنیا کی تقریباً تمام مہذب زبانوں میں ہو چکا
ہے ۔ انگریزی ۔ روسی ۔ جرمن ۔ فرنچ ۔ سویڈش ۔ عربی ۔ چینی وغیرہ وغیرہ
جرمن زبان میں دنیا کی بہترین کہانیوں کا ایک انتخاب چھپا ہے
اس میں یہ کہانی شامل کی گئی ہے ۔ اسی طرح ڈاکٹر ملک راج آنند اور
اقبال سنگھ نے جو انتخاب کیا ہے ۔ اُس میں بھی یہ کہانی شامل ہے ۔

کرشن : اس کہانی کا موضوع کیا ہے ؟

عباس : یہ ایک ظالم کسان کی زندگی سے متعلق ہے ۔

کرشن : تمھیں کسانوں کی زندگی کے بارے میں کیا معلوم ہے ۔

عباس : عجیب بات ہے کہ اس کہانی کے لکھتے وقت مجھے کسانوں کے
بارے میں بہت کم معلوم تھا اس اعتبار سے کہ اُن کی زندگی کے بارے
میں میرا ذاتی مشاہدہ اور تجربہ بہت کم تھا صفر ہی کہنا چاہیے ۔
اس لیے کہ میں آج تک گاؤں میں نہیں رہا ۔ کسانوں کی زندگی سے
ناواقف ہوں ۔ مگر یہ کہانی نہ صرف قومی معیار سے بلکہ بین الاقوامی ادب
کے معیار سے بھی بلند مرتبہ سمجھی جاتی ہے ۔

کرشن : یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمھیں کسانوں کی زندگی کے بارے میں کچھ معلوم
نہ ہو اور تم اُن کے متعلق اتنی اچھی کہانی لکھ سکو ۔

عباس : یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کسانوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا ۔

ذاتی مشاہدہ اور تجربہ نہیں تھا لیکن گھر میں سیاسی بحثوں کے اندر اور بعد میں باہر کی دُنیا میں کسانوں کا اکثر ذِکر آتا تھا۔ سیاسی اور معاشی کتابیں پڑھ کر بھی میں اُن کی زبوں حالی سے واقف ہو چکا تھا۔ علی گڑھ میں ہر اتوار کو ہم چند لوگ ہم خیال طالب علم سوشل سروس کے بہانے دیہات میں پہنچ جایا کرتے تھے۔ اور وہاں کسانوں کی زندگی کا مطالعہ کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

کرشن : تم نے اپنے ننھیال کے بارے میں تو بتایا۔ لیکن ددھیال کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

عباس : میرے دادا کاشتکار تھے۔

کرشن : دیکھئے۔ اب ابابیل پکڑی گئی۔ دیکھئے کہاں جا کے اس نے گھونسلا بنایا۔

عباس : عجیب بات ہے اب مجھے یاد آرہا ہے۔ کہ میرے دادا کسان تھے۔ مگر وہ اپنے خاندان کو آگے بڑھتے ہوئے ، ترقی کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔ مگر زراعت میں نہیں۔ تجارت میں۔ اُن دِنوں تم جانتے ہو خاص طور پر مسلمان تجارت میں بہت پیچھے تھے۔ میرے دادا نے کپڑے کی دُکان کھولی۔ مگر تجارت اُنھیں راس نہ آئی۔ چند مہینوں ہی میں دادا کے دوست اور اقربا دُکان کا سارا کپڑا اُدھار پر لے گئے۔ اور میرے دادا کو دُکان بند کرنی پڑی۔ پھر اُنھوں نے اپنے لڑکوں کی پڑھائی کی طرف توجہ دی۔ زمین کی پیداوار سے تو وہ

بچوں کو نہیں پڑھا سکتے تھے۔ اس لئے اُنھوں نے زمین کا ایک تہائی ٹکڑا بیچا۔ اور اپنے ایک لڑکے کو پڑھایا۔ پھر دوسرا ٹکڑا بیچا اور دوسرے لڑکے کو پڑھایا۔ پھر تیسرا ٹکڑا بیچا۔ اور تیسرے لڑکے کو پڑھایا۔ تینوں بیٹے پڑھ لئے اور زمین ختم ہو گئی۔ اس لئے جب میرے دادا مرے تو میرے باپ کو ورثے میں زمین کا ایک ٹکڑا بھی نہ ملا۔

کرشن : گویا تم ایک "بے زمین" کسان کے بیٹے ہو۔

عباس : ہاں۔

کرشن : اس سے یہ بات بھی کھلتی ہے۔ کہ ایک اچھی تخلیق کے لئے یہ ضروری نہیں ہے۔ کہ مصنف کا تجربہ براہِ راست ہو۔ وہ براہِ راست بھی ہو سکتا ہے۔ اور بلا واسطہ بھی۔

عباس : ہاں، مثال کے طور پر۔ ایک قاتل کے کردار کی تخلیق کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ مصنف نے بھی خود قتل کیا ہو۔ یا ایک طوائف کی زندگی بیان کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ مصنف خود بھی کسی طوائف کے ساتھ سو چکا ہو۔

کرشن : تم کبھی سوئے ہو۔

عباس : نہیں!.... اور تم؟

کرشن : انٹرویو میں کر رہا ہوں۔ کہ تم، میرے سوال کا جواب دو، کیوں نہیں سوئے۔

عباس : نہیں سو سکا، ایک بار چند احباب گھسیٹ کر مجھے اس محفل میں لے بھی

گئے ۔ مگر میں جلدی وہاں سے بھاگ آیا ۔ دراصل کرشن بات یہ ہے کہ انسان نے اپنی تہذیبی کاوش سے جنسی فعل کو محبت کی اس بلند سطح پر پہنچا دیا ہے کہ جہاں سے نیچے گرنا جانور بننے کے مترادف ہے ۔

کرشن : تم نے کبھی محبت کی ہے ؟

عباس : ہاں ۔

کرشن : شادی سے پہلے یا شادی کے بعد ، ڈرو نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ تمھاری بیوی یہاں موجود نہیں ہے ۔ اس لئے صاف صاف بتا سکتے ہو ۔

عباس : بیوی سے میں ڈرتا نہیں ہوں ۔ نہ میری بیوی مجھ سے ڈرتی ہے ۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت گہرے دوست اور ساتھی ہیں ۔ وہ میرے تمام راز جانتی ہے ۔ اُسے میری اس محبت کا بھی علم ہے ۔ جو شادی سے بہت پہلے کا واقعہ ہے ۔ دراصل اس محبت کی محرومی ہی نے مجھ سے ابابیل کے بعد کی دو کہانیاں لکھوائیں ۔ فیصلہ اور ایک لڑکی ، اور یہ فیصلہ ایک لڑکی یہ دونوں کہانیاں غمِ جاناں کے دو مختلف مدارج کو بیان کرتی ہیں ۔ فیصلہ میں میں بہت جذباتی ہوں ۔ ایک لڑکی میں میں اس محبت کو مزاح کے ذریعے اس پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہوں ۔

کرشن : گویا زندگی محبت پر بھی حادی ہے ۔

عباس : یہی سمجھ لو ۔ مگر میری یہ محبت بڑی عجیب سی محبت تھی ۔ وہ بے حد حسین تھی ۔ ادبی ذوق رکھتی تھی ۔ ہم لوگ گھنٹوں پاس بیٹھے باتیں

کہتے رہتے۔ مگر تم یقین کرو گے۔ میں نے اُسے کبھی ہاتھ سے بھی نہیں چھوا۔ کبھی ایک کلمۂ محبت بھی زباں پر نہیں لایا۔

کرشن: یہی تمھاری سب سے بڑی غلطی تھی پیارے۔

عباس: (گالی دے کر) سالے...... مگر اُسے میری محبت کا علم تھا۔

کرشن: پھر شادی کیوں نہیں ہو سکی؟

عباس: شاید اس کے خاندان والے نہیں چاہتے تھے۔ اور میرے خاندان والے تو بہت ہی خلاف تھے۔ گو اس مخالفت سے بھی زیادہ قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ اپنی محبت کی ناکامی کے اثر کو لئے ہوئے آخری بار جب میں اُس سے مل کر گھر لوٹ رہا تھا۔ تو رستے میں اک عجیب احساسِ مرگ نے مجھے گھیر لیا۔ میرا دم گھٹنے لگا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں ابھی ابھی رستے میں مر جاؤں گا۔ لیکن جب میں ریلوے سٹیشن پر پہنچا اور لوگوں کی بھیڑ بھاڑ دیکھی تو اس سٹیشن کی چہل پہل سے میرا یہ احساسِ مرگ فوراً زائل ہو گیا۔ اس احساس کو میں نے اپنے ایک غیر مطبوعہ ناول کے ایک باب میں یوں بیان کیا ہے:

"آخر کار وہ رو سکا۔ اور اس کے سینے میں غم کا گھٹا ہوا غبار آنسوؤں کے تیز بہاؤ میں تبدیل ہو گیا۔ مسجد کے کھلے اور وسیع دالان میں کھڑے ہو کر بلند میناروں کے سایوں میں اس نے اپنے آپ کو بالکل حقیر، اکیلا، تنہا، بے یار و مددگار اور اس قہرمانی قوت سے خوفزدہ پایا جسے

وہ ابھی اچھی طرح سے کوس چکا تھا۔ اس نے اپنے آنسو پونچھ لئے، اور مکان سے لنگڑاتا ہوا باہر چلا آیا اور سوچنے لگا۔ کیا محبت کے بغیر زندہ رہا جا سکتا ہے!

"مشرقی دروازے سے باہر نکل کر چند ثانیوں کے لئے، وہ مسجد کی بلند و بالا سیڑھیوں پر کھڑا ہو گیا۔ سامنے افق پر سپیدۂ سحر میں سورج کا گلاب اور سونا گھل رہا تھا۔ نیچے لوگ باگ کام کاج کے لئے باہر نکل رہے تھے۔ سفید ساریوں میں ملبوس عورتیں دریا کی طرف جا رہی تھیں۔ ایک ٹرام شور مچاتی ہوئی گزر گئی۔ ایک دھچکے کے ساتھ جو بعد میں ایک گہرے سکوت میں تبدیل ہو گیا اُس نے محسوس کیا کہ اُس کی محبت کی محرومی کے بعد بھی دُنیا ختم نہیں ہوتی ہے۔ زندگی اُسی طرح سے جاری و ساری ہے، سحر ہوتی ہے۔ لوگ کام کرتے ہیں۔ زندگی میں موت اور موت میں زندگی آتی ہے۔

"اور اب اُسے یاد آیا کہ غالب نے جو کچھ کہا تھا ٹھیک تھا۔ ایک گونج کے ساتھ اس کے خیالات اُس کے پاس لوٹ آئے،۔ ایک تخلیق تھی۔ ایک موت تھی۔ اور راتوں کے درمیان کرب کا ایک لمبا سلسلہ تھا۔ مگر اس سلسلے میں زندگی بھی تھی۔ زندگی جو اس کے سامنے پھول کی طرح درخشاں تھی۔ عورتیں اور مرد چلتے ہوئے، بچے اسکول جاتے ہوئے، ٹرام پسنجروں سے بھری ہوئی، اخبار بیچنے والے لڑکے آج کی سُرخیوں پر شور مچاتے ہوئے......

"اُس لمحے میں اُس کے اندر انجانے طریق پر ایک نیا اعتقاد پیدا ہوا۔ اُس لمحے میں انجانے طریق پر وہ بچے سے جوان ہو گیا۔"

عباس: میں اس کی تاویل یوں کرتا ہوں کہ باہر کی دُنیا نے باطن کے زخم پر مرہم رکھا۔

کرشن: یعنی غمِ جاناں غمِ دوراں میں بدلتا نہیں ہے۔ غمِ دوراں سے غمِ جاناں کا علاج کیا جاتا ہے!

عباس: ہاں! جو باطنی حقیقت ہے وہ خارجی حقیقت کے تابع ہے۔ اور انسان کے اندر جب محبت کی محرومی کے باعث مرجانے کا خیال پیدا ہوتا ہے اُس وقت میں خارجی حقیقت اُسے زندہ رہنے کی ترغیب دلاتی ہے۔

کرشن: مگر محبت کی کہانیوں کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے۔ کیا عشقیہ کہانیوں کا جنھیں بعض لوگ غلطی سے رومانی کہانیاں کہہ کر پکارتے ہیں۔ کیا ایسی عشقیہ کہانیوں کا ترقی پسند ادب میں گزر ہے کہ نہیں؟

عباس: محبت زندگی اور سماجی حقیقت کا ایک ضروری جزو ہے۔ اکثر اوقات محبت کی تلخی ساری زندگی کو تلخ بنا دیتی ہے۔ اگر اِس تلخی کو ٹھیک طرح سے رد نہ کیا جائے تو بعض اوقات بہت بُرے نتائج سامنے آتے ہیں۔ اس لئے افادی ادب میں عشقیہ کہانیوں کی ہمیشہ جگہ رہے گی۔ لیکن میں ایسی رومانی کہانیوں کو پسند نہیں کرتا جن میں رومان کے پردے میں فرار کا راستہ دکھایا گیا ہو۔

کرشن: کبھی کبھی محبت کی تلخی زندگی بھر مزا دیتی ہے۔

عباس: ہاں۔ اگر یہ تیر نیم کش ہو۔

کرشن: اور جگر کے پار ہو۔ اس تلخی کے شدید جذبے کا دھارا اگر دوسری طرف موڑ دیا جائے، اور زندگی پر حملہ کرنے کے بجائے اگر یہ موت پر شاہین بن کر جھپٹے۔

عباس: تو ٹھیک ہے، ورنہ یہ مرض آدمی کو فانی بنا دیتا ہے۔ مجھے اس سے ہنگری کی ایک کہانی یاد آتی ہے۔ ایک آدمی کو بہت پیاس لگتی تھی، اور یہ پیاس کسی طرح سے نہ بجھتی تھی۔ ایک آدمی نے کہا۔ پانی پی لو، مگر پیاسے کی پیاس بہت سا پانی پی کر بھی نہ بجھی۔ پھر کسی نے شربت بتایا۔ مگر پیاس پھر بھی نہ بجھی۔ پھر کسی نے کہا۔ شراب پیو۔ مگر پیاسے کی پیاس شراب پی کر بھی نہ بجھی۔ پھر کسی نے کہا۔ خون پیو۔ پیاسے نے ایک آدمی کو قتل کر کے اس کا خون پیا۔ مگر اس کی پیاس پھر بھی نہ بجھی۔ آخر کار جب اُسے پھانسی پر چڑھایا جا رہا تھا اُس وقت پھانسی کے تختے پر یکایک اُسے یاد آیا۔ کہ ایک بار جب وہ بہت چھوٹا سا تھا، اور ماں کی چھاتی سے لگا دودھ پی رہا تھا، کسی نے اُسے زور سے جھٹک کر ماں کی چھاتی سے الگ کر لیا تھا اور جب سے وہ پیاسا تھا۔ گویا اُس کی جو خونی پیاس تھی وہ اپنی پہلی شکل میں ماں کے دودھ کی پیاس تھی، ....

کرشن: .... اسی طرح میں سوچتا ہوں کہ محبت کی پیاس بھی بڑی خطرناک

ہو سکتی ہے۔

عباس: .... اب اگر میں اُن تمام عناصر کو اکھٹا کروں جنھوں نے میرے ادبی ذوق کی تشکیل کی تو میں اُنھیں سلسلے وار یوں رکھوں گا ـــ (۱) گھر کا ادبی اور تہذیبی ماحول (۲) حب الوطنی کا جذبہ جو سارے ملک میں قومی تحریک کی صورت میں اُبھرا (۳) بڑی صحت اور محبت کی ناکامی۔

کرشن: بہت سے ادیب کم و بیش اِنہی راستوں سے ادب میں آئے ہیں۔ اچھا اب یہ بتاؤ۔ تم نے پریم چند کب پڑھا تھا۔ میں تو تمھیں بتا چکا ہوں۔ کہ میں نے پریم چند بچپن میں پڑھا، جب میں تیسری جماعت میں پڑھتا تھا۔

عباس: (بات کاٹ کر) میں نے پریم چند بہت بعد میں پڑھا۔ دراصل میں نے پریم چند کو کالج میں پڑھا۔ مگر شروع شروع میں پریم چند کی کہانیوں کا کوئی خاص اثر مجھ پر نہیں ہوا۔ ہاں اُن کی کہانیوں سے اُن کے ناولوں کو میں نے زیادہ پسند کیا تھا۔ وہ بھی بہت بعد میں۔

کرشن: بعد میں تم نے پریم چند کے بارے میں کیا تاثرات حاصل کیے۔

عباس: بعد میں پریم چند کو پڑھ کے مجھے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے میں زندگی میں پہلی بار اپنے دیہات کے عوام سے مل رہا ہوں۔ یہ اور اس کے ساتھ دوسرا احساس یہ تھا، کہ پریم چند کی تخلیقات میں مجھے اپنے ملک کی قومی تحریک کی عکاسی اور اس کی کامیابی کا روشن مستقبل

نظر آتا ہے۔

کرشن: ٹیگور سے متاثر ہوئے؟

عباس: نہیں۔ دراصل میری افتادِ طبع شاعروں کے بجائے نثر نگاروں سے زیادہ متاثر ہوتی ہے۔ کچھ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعروں میں داخلیت ضرورت سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ اِس لئے میں ٹیگور سے زیادہ متاثر نہیں ہو سکا

کرشن: مغربی ادیبوں میں سے کس کس کو شوق سے پڑھا؟

عباس: ہارڈی کو، شا کو، پھر موپساں کہانیوں میں، او ہنری۔ اور سومرسٹ ماہم جو دراصل موپساں ہی کا ایک ضمیمہ ہے۔

کرشن: امریکی ادیبوں میں؟

عباس: امریکی ادیبوں میں ڈوس پاسو کی حقیقت سازی سے میں نے سیکھا ہے۔ سٹائن بیک اور ہمنگ وے کو بھی بڑے غور سے پڑھا ہے۔ مگر موضوعی اعتبار سے تھیوڈر ڈریسر بہت ممتاز نظر آیا۔

کرشن: اور اپٹن سنکلیر۔ مجھے معلوم ہے۔ شروع شروع میں مجھے اپٹن سنکلیر بہت اچھا معلوم ہوا تھا۔ اس کے ناول "تیل" اور "جنگل" خاص طور پر مجھے پسند آئے تھے۔ لیکن مجھے اس کی موجودہ کتابیں پسند نہیں آئیں۔

عباس: ہاں اب اس کا زاویۂ نگاہ بہت بدل گیا ہے۔ اور اس کا اثر اس کے فن پر اُس کے کرداروں پر اور اس کے بیان پر تو پڑے گا ہی۔ یہی

بات تم ہمنگ وے کے بارے میں بھی کہہ سکتے ہو۔

کرشن : روسی ادیبوں میں تمھیں کون سب سے زیادہ پسند ہے۔

عباس : چیخوف اور گورکی۔

کرشن : اور جدید سوویت ادیبوں میں ....؟

عباس : جدید سوویت ادیبوں میں سے .... در اصل میں نے جدید سوویت ادیبوں کو بہت کم پڑھا ہے۔ اور جو بھی پڑھا ہے۔ وہ بھی مجتی (عباس کی بیوی) کے اُکسانے سے پڑھا ہے۔ مگر میں نہیں سمجھتا کہ جدید سوویت ادب میں کوئی بھی گورکی کی طرح سر بلند ہے۔

کرشن : شولوخوف کے بارے میں کیا کہو گے؟

عباس: شولوخوف اپنے ناولوں کے بعض حصّوں میں بلند ہے۔ مگر بعض مقامات پر بور کرنے لگتا ہے۔

کرشن : گورکی کو ہم لوگ جو بہت پسند کرتے ہیں۔ اُس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ گورکی جس زندگی کو بیان کرتا ہے وہ روسی انقلاب سے پہلے کی زندگی ہے۔ اور اس زندگی کی مماثلت ہماری اپنی زندگی میں بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن آج کے سوویت ادیب جس زندگی کے بارے میں لکھتے ہیں اس کی سطح ہماری زندگی سے بہت بلند ہے۔ وہاں ایسے نئے کردار پیدا ہو چکے ہیں جن کے سوچنے سمجھنے کام کرنے کا طریقہ ہم سے بالکل الگ ہے۔ اور جب ہم اُن انسانوں کو سوویت ادب میں دیکھتے ہیں۔ تو وہ ہمیں بالکل اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔

عباس : میں سمجھتا ہوں کہ ادب سماجی آویزش اور کرب سے پیدا ہوتا ہے۔
آج کے سوویت سماج میں آویزش اور کرب کے عناصر بہت کم ہو گئے
ہیں۔ ایک مثبت سماج میں جہاں خوشحالی اور شادابی ہی شادابی ہو۔
وہاں ادب کی سماجی آویزش کی سربلندی کہاں سے آئے گی؟
کرشن : سوویت سماج کے مثبت سماج ہونے میں شک نہیں۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا
کہ وہاں آج کسی قسم کی آویزش اور کرب باقی نہ رہے، مثبت سماج ہوتے
ہوئے بھی وہاں منفی کردار ضرور ہوں گے، خود سوویت ادیبوں میں آج کل
ادب میں منفی کرداروں کی ضرورت پر بحث چھڑی ہوئی ہے، کیوں کہ
سوویت سماج کوئی ایک نہ بدلنے والا سماج تو ہے نہیں، اور بدلنے والا
سماج ہے تو کوئی چیز پرانی ہو جائے گی، اور کوئی نئی پیدا ہو گی۔ اور
یہ آویزش خود بخود مثبت اور منفی کرداروں کو پیدا کرے گی۔ اس لئے
تمھیں اپنی رائے کے لئے دوسری دلیل ڈھونڈنی پڑے گی۔
عباس : اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں دراصل موجودہ سوویت ادب کے
بارے میں کوئی مستحکم رائے نہیں رکھتا۔ کیوں کہ میں نے اسے بہت کم
پڑھا ہے۔
کرشن : تمھارے خیال میں کیا ادب میں سیاست کا دخل ہونا چاہئے!
عباس : اس کے بغیر ادب کی تشکیل ناممکن ہے۔ ہر چیز کہانی کا موضوع ہو سکتی
ہے۔ چاہے وہ اقتصادی، سیاسی، جنسی ہو یا جغرافیائی۔ کہانی کا موضوع
کوئی سا بھی ہو سکتا ہے، مگر شرط یہ ہے۔ کہ دلچسپ معلوم ہو اور انسانیت

سے خالی نہ ہو۔

کرشن : ہئیت اور پلاٹ کے بارے میں کیا خیال ہے۔

عباس : میں ہئیت اور پلاٹ کے بغیر کسی کہانی کا تصور ہی نہیں کر سکتا۔ دراصل ہئیت اور پلاٹ ہر کہانی میں ہوتے ہیں۔ لیکن کسی میں گٹھ کر آتے ہیں اور کسی میں بڑے بھدّے اور بے ڈول معلوم ہوتے ہیں۔ یوں سمجھو کہ مواد افسانے کا جسم ہے اور ہئیت اس کا لباس ہے۔ کبھی یہ لباس چسُت معلوم ہوتا ہے اور فٹ۔ کبھی ناموزوں اور ڈھیلا ڈھالا معلوم ہوتا ہے۔

کرشن : تم نے تو افسانہ نگار کو درزی بنا دیا۔ خیر اسے چھوڑو۔ کیا افسانے کی ہئیت بدل سکتی ہے۔ یا کہ پرانے درزیوں کے سلے ہوئے کپڑوں کی نقل کرنا ہی ہمارے لئے کافی ہے۔ جیسے موپساں، او ہنری سومرسٹ ماہم اور دوسرے ایسے بڑے جگادری اُستاد درزی جن کے ہاں بڑے ڈھلے ڈھلائے، استری شدہ سکے بند کردار ملتے ہیں۔

عباس : ہئیت کو بدلنا ہی چاہئے۔ کیوں کہ ہئیت موضوع کے ساتھ بدلتی ہے۔ اور ہمارے آج کے افسانوں کا موضوع او ہنری اور موپساں کے موضوعات سے الگ ہے۔ کیوں کہ زندگی بہت آگے جا چکی ہے۔

کرشن : مواد سے قطع نظر مجھے تو او ہنری اور موپساں کے بہت سے افسانے بڑے جیومیٹرک (Geometric) نظر آتے ہیں۔ مثلث کا ہر زاویہ ٹھیک ہے۔ اور دو اور دو ہمیشہ چار ہوتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں۔

ادب ریاضی سے کہیں مختلف ہے۔ یہاں دو اور دو تین ہوتے ہیں۔ اور کبھی دو اور دو پانچ بھی ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہاں ہم اکائیوں سے بحث نہیں کرتے۔

عباس : یہاں مجھے تم سے اتفاق ہے۔ مجھے خود او ہنری کے اکثر افسانوں میں جیومیٹری کا احساس زیادہ اور انسانی جذبات اور ضروریات کا احساس کم معلوم ہوتا ہے۔ ان لوگوں کی افسانوی ہئیت ہمارے آج کی دنیا میں زیادہ مفید نہ ہو گی۔ میں نے خود پہلے ڈوس پاسو اور بعد میں تمہاری چند کہانیوں کے ہئیتی تجربوں سے جرأت پا کر اپنے افسانوں میں گوناگوں ہئیتی تجربے کئے ہیں۔

کرشن : کیا مصنف کا اپنا کردار اور اس کا "میں" اور اس کے احساسات وخیالات ادب میں جگہ پانے کے حقدار ہیں۔

عباس : ادب ادیب سے الگ ہو کر کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ ادب ایک ادیب کی شخصیت اس کے خیالات حسیات و احساسات کی تخلیق ہوتا ہے اور اس سے باہر نہیں جا سکتا۔

کرشن : اس لئے لازماً ایسے ادب کے زورِ بیان میں۔ شوکت الفاظ میں۔ افسانوی زمان و مکان میں اُس ادیب کی انفرادی ادا جھلکے گی۔ اور اُس کے کرداروں کی تعمیر میں اور ان کی افسانوی ہست و بود میں اس کی شخصیت اس کے نظریوں اور اُس کی زندگی کے تجربوں کا عکس نظر آئے گا۔

عباس : ہاں یہ لازمی ہے۔ مگر یہ بھی ضروری ہے کہ خاص کر افسانوں اور ناولوں میں۔ کہ سوانحی طرزِ تحریر اس قدر نہ بڑھ جائے کہ ہر ادبی تخلیق سوانح حیات معلوم ہو۔ سوانح حیات کو بھی ادب کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ مگر ہر ادبی تحریر سوانح حیات نہیں بن سکتی۔ آپ بیتی اگر جگ بیتی بھی معلوم ہو تو لطف بڑھ جاتا ہے۔

کرشن : دوسرے الفاظ میں آپ اپنے شخصی تجربوں کو اُسی حد تک ناول اور افسانے کا موضوع بنا سکتے ہیں جہاں تک وہ ہم عصر سچائی اور حقیقت سے مطابقت کرتے ہو

عباس : ہاں۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ ایک مصنف کو اپنے آپ کو اپنے کرداروں میں (Extend) کرتے ہوئے بھی اُن سے الگ تھلگ رہنا چاہیے۔ جیسے ایک ڈاکٹر اپنے مریضوں سے ہمدردی رکھتا ہوا بھی ان سے الگ رہتا ہے۔ اُسے ڈاکٹر رہنا چاہیے۔ خود مریض نہیں بننا چاہیے۔ جیسے بہت سے افسانہ نگار جنسی تلذذ کا شکار ہو جاتے ہیں۔

کرشن : جنسی سے تخلیق اور تخلیق سے خالق یاد آیا۔ خدا کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟

عباس : خدا اور شیطان کے بارے میں میرا تصور اُس طرح کا نہیں ہے۔ جس طرح بہت سے لوگ سوچتے ہیں۔ ہاں میں خدائی اور شیطنت، نیکی اور بدی، ترقی اور تنزلی کے سلسلے میں یقین رکھتا ہوں میرا ذہن

ایک ایسے اخلاقی نظام کو پسند کرتا ہے جس میں انسان انسان کے لئے سچی خوشی لائے!

کرشن: مگر میں خدا کے مجرّد تصوّر کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ یعنی ایک ایسی مجرّد ہستی جو موجودہ آفاقی نظام کی ترتیب اور اس کے اسباب و عمل کے سلسلوں کی ذمے دار ہو سکتی ہے۔

عباس: دراصل سائنسی نکتہ نگاہ سے ہماری معلومات آفاقی نظام اور کائناتی تبدیلیوں کے بارے میں اس قدر محدود ہیں کہ فی الحال کسی ایسی مجرد ہستی کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ تم یوں کہہ سکتے ہو کہ میں خدا سے منکر نہیں ہوں۔ مشکوک ضرور ہوں۔ میں عقلیت پرست ہوں اور انسانی سائنس عمل اور کاوش پر یقین رکھتا ہوں۔

کرشن: خدا سے مارکسزم کی طرف آنا بڑا عجیب معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ اس لئے آخری سوال پوچھتا ہوں۔ مارکسزم کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے۔

عباس: میں مارکسزم کو بنیادی طور پر صحیح سمجھتا ہوں۔ لیکن میں یہ صحیح نہیں سمجھ سکتا کہ مارکسزم میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی۔ آج کے حالات میں، ماضی کی روشنی میں، عقل و فہم اور سائنس کے تجربوں کی بنا پر، مارکسزم زندگی کا صحیح فلسفہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ آخری سچائی نہیں ہے۔

کرشن: آخری سچائی کی صورت تو کسی نے نہیں دیکھی۔ کیوں کہ سچائی ایک زینہ ہے۔ جو انسانی ارتقا کے ساتھ سطح بہ سطح اوپر جاتا ہے۔ ہاں

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج کے علم اور سائنس کی روشنی میں مارکسیت کا فلسفہ انسان کو بہت آگے لے جا سکتا ہے اور اس کے لئے ایک درخشاں مستقبل تعمیر کر سکتا ہے۔!

عباس: کر سکتا ہے! مگر یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے۔ کہ اس درخشاں مستقبل کی اوٹ میں کتنے ہی اس سے بہتر مستقبل چھپے ہوئے ہیں۔ میں مارکسزم پر اعتقاد رکھتا ہوں۔ مگر یہ بھی سمجھتا ہوں کہ یہ انسانی تاریخ کا اگلا قدم ہے آخری قدم نہیں ہے۔

کرشن چندر

دِیا جلے ساری رات

جہاں تک نظر جاتی تھی ساحل کے کنارے کنارے ناریل کے پیڑوں کے جھنڈ پھیلے ہوئے تھے۔ سورج دور سمندر میں ڈوب رہا تھا اور آکاش پر رنگا رنگ کے بادل تیر رہے تھے۔ بادل جن میں آگ کے شعلوں جیسی چمک تھی اور موت کی سیاہی، سونے کی پیلاہٹ اور خون کی سُرخی!

ٹراونکور کا ساحل اپنے قدرتی حُسن کے لئے ساری دنیا میں مشہور ہے میلوں تک سمندر کا پانی زمین کو کاٹتا، کبھی پتلی نہروں کے لہریئے بناتا کبھی چوڑی چکلی جھیلوں کی شکل میں پھیلتا ہوا چلا گیا ہے۔ اُس گھڑی مجھ پر بھی اس حسین منظر کا جادو دھیرے دھیرے اثر کرتا جا رہا تھا۔ سمندر شیشے کی طرح ساکن تھا مگر کبھی ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا اور سمندر کی سطح پر ہلکی ہلکی لہریں ایسے کھیلنے لگیں جیسے کسی بچے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی ہے۔ دور ــــ بہت دور ــــ کوئی مچھیرا بانسری بجا رہا تھا۔ اتنی دور کہ بانسری کی پتلی دھیمی تان پھیلے ہوئے

سناٹے کو اور گہرا بنا رہی تھی۔

میرا ناؤ والا بھی اُس سحر آفریں ماحول سے متاثر معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ہی ہماری لمبی پتلی کشتی ناریل کے جھنڈوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی کھلے سمندر میں آئی، اس نے چپوؤں پر سے ہاتھ ہٹا لئے۔ سمندر کی طرح وہ بھی خاموش تھا۔ کشتی نہ آگے جا رہی تھی نہ پیچھے لہروں کی گود میں دھیرے دھیرے ڈول رہی تھی۔ فضا اتنی حسین، اتنی شانت، اتنی خواب آور تھی کہ زرا سی حرکت یا دھیمی سی آواز بھی اُس وقت کے طلسم کو توڑنے کے لئے کافی تھی۔ کشتی ڈول رہی تھی۔ کشتی والا چپ چاپ ٹکٹکی باندھے سورج کو ڈوبتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ میں خاموش تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ہوا بھی سانس روکے ہوئے ہے۔ سمندر گہری سوچ میں ہے اور دنیا بھی گھومتے گھومتے رُک گئی ہے۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا کوی لون کے قصبے کو ہم بہت دور چھوڑ آئے تھے۔ اب تو ساحل کے کنارے والے ناریل کے جھنڈ بھی نظر نہ آتے تھے اور دور سے آتی ہوئی ٹرین کی سیٹی کی آواز ایسی سنائی دیتی تھی جیسے کسی دوسری دنیا سے آ رہی ہو۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس چھوٹی سی کشتی میں بہتے بہتے ہم کسی دوسرے ہی سنسار میں جا نکلے ہوں۔ یا بیسویں صدی کی دنیا، اس کے تمدن اور ترقی کو بہت دور چھوڑ آئے ہوں اور کسی پچھلے یگ میں پہنچ گئے ہوں۔ جب انسان کمزور تھا اور قدرت کے ہر مظہر کے سامنے ماتھے ٹیکنے پر مجبور تھا۔ یہاں سمندر گہرا تھا اور آکاش اونچا تھا بہت اونچا اور سمندر اور آکاش کے درمیان ایک ننھی سی، کمزور سی، حقیر سی کشتی ڈول رہی تھی۔ اور چھوٹا سا، کالا سا، ادھ ننگا کشتی والا ایسا لگتا تھا جیسے کسی پرانے زمانے سے

بھٹک کر ادھر آنکلا ہو جب انسان نے ناؤ بنانا اور چپو چلانا سیکھا ہی تھا۔

سورج کی آتشیں گیند سمندر کی سطح پر ایک پل کے لیے ٹھٹکی اور پھر دھیرے دھیرے پانی میں ڈوب گئی۔ پھر اس کی آخری کرنیں بھی مغربی آسمان پر گلابی غازہ ملتے ہوئے رخصت ہو گئیں اور تھوڑی دیر بعد ہی موت کی پرچھائیں کی طرح گہرا اندھیرا آسمان اور زمین دونوں پر چھا گیا۔ اتنا گہرا اندھیرا کہ میرا دم گھٹنے لگا۔ میں کشتی والے سے کہنے ہی والا تھا کہ کوئی لوٹ واپس چلو کہ کچھ دیکھ کر میں ٹھٹک گیا اور حیرت سے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ منظر تھا ہی اتنا عجیب۔ کیا دیکھتا ہوں کہ دور سمندر میں ایک چراغ بہتا ہوا چلا جا رہا ہے۔

"وہ کیا ہے"، آخر کار میں نے کشتی والے سے پوچھا۔

پیچھے مڑ کر اس انوکھے چراغ کو دیکھے بغیر ہی وہ بولا۔ "ابھی آپ خود ہی دیکھ لیں گے، صاحب" نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا کہ یہ کہتے وقت اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

وہ کشتی والا تھا بیچ مچ عجیب ہی آدمی۔ شکل سے نہ جوان لگتا تھا نہ بڈھا۔ ٹراونکور میں ٹوٹی پھوٹی انگریزی تو تقریباً ہر ایک ہی بول سکتا ہے مگر وہ اچھی خاصی ہندوستانی بھی بول لیتا تھا۔ اصل میں میں نے اسی لئے اس کی کشتی کرائے پر لی تھی۔ ایک اور وجہ بھی تھی۔ میں مسافروں سے بھری ہوئی دوسری بڑی بڑی کشتیوں میں سیر کرنا نہ چاہتا تھا۔ میں سکون اور خاموشی چاہتا تھا، چیخ پکار اور ہنگامہ نہیں۔ کوئی با تونی کشتی والا مل جاتا

تو بے کار بک بک سے سارا مزا کرکرا کر دیتا۔ "صاحب، یہ دیکھو، صاحب وہ دیکھو، یہ لائٹ ہاؤس دیکھو، وہ ٹاپو دیکھو۔ صاحب کتنے دن ٹھیرو گے۔ صاحب یہاں سے کہاں جاؤ گے ؟ صاحب تم کہاں کے رہنے والے ہو ؟ صاحب بیوی بچّوں کو ساتھ نہیں لائے ؟ ...." مگر میرا کشتی والا میری طرح خاموشی پسند تھا۔ گھنٹہ بھر میں اُس نے مشکل سے دو چار باتیں کی ہوں گی۔ چپ چاپ بیٹھا چپّو چلاتا رہا۔ اور اس تمام عرصے میں اُس کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ اتنا بڈھا تو نہ تھا پھر اُس کے چہرے پر یہ جھریاں کیسے پڑیں، اُس کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں یہ دُکھ کی پرچھائیں کیوں تھی ؟ وہ اتنا خاموش کیوں تھا ـــــ جیسے زندگی سے بالکل تھکا ہوا اور بیزار ہو۔ جیسے دنیا کے سارے دکھ سکھ اس پر گزر چکے ہوں اور اب وہ وہاں پہنچ گیا ہو جہاں نہ دکھ ہے نہ سکھ ہے صرف ایک گہری، انتھاہ مایوسی ہے اور اکتاہٹ ہے۔ ہاں تو میں نے اس سے پوچھا "وہ کیا ہے ؟" اور اس نے پیچھے مڑے بغیر جواب دیا: "ابھی آپ خود ہی دیکھ لیں گے صاحب ......" جیسے اُسے پہلے ہی سے معلوم ہو کہ میں کس انوکھے نظارے کی طرف اشارہ کر رہا ہوں اور پھر اُس نے ہماری کشتی کو دھیرے دھیرے اسی طرف کھیتا شروع کر دیا جدھر اندھیرے سمندر میں وہ روشنی بہتی ہوئی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک اور کشتی چلی جا رہی ہے۔ جسے ایک اکیلی عورت کھے رہی ہے اور اس کشتی میں ایک لالٹین رکھی ہے جس کی روشنی دور سے میں نے دیکھی تھی۔ اتنی رات کو اندھیرے سمندر میں وہ کہاں جا رہی تھی اور کیوں ؟ کیا وہ سچ مچ

کی کشتی تھی یا صرف میرے تخیل کا ہیولٰے جو اس طلسمی اندھیرے ماحول میں اُبھر آیا تھا میں نے دیکھا کہ میرے مانجھی نے اپنی کشتی کو عورت کی کشتی سے کافی فاصلے پر رکھا تاکہ ہم اندھیرے میں چھُپے رہیں اور ہمیں نہ دیکھ سکے۔ مگر لالٹین کی روشنی کے دائرے میں وہ اچھی طرح نظر آرہی تھی۔ ایک میلی سی ساڑھی میں لپٹی ہوئی دُبلی پتلی عورت تھی مگر اُس وقت چہرہ ساڑھی کے آنچل میں چھپا ہوا تھا۔ اُس کی کشتی بیچ سمندر میں ایک جگہ جا کر رُک گئی۔ جہاں ایک ڈوبے ہوئے درخت کا ٹھنٹھ پانی سے باہر نکلا ہوا تھا۔ سمندر میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ایسے کتنے ہی ٹھنٹھ آسمان کی طرف اُنگلی اُٹھائے کھڑے تھے۔ مگر اس درخت پر ایک لالٹین بندھی ہوئی تھی۔ جس میں اب اس عورت نے تیل ڈالا اور پھر دیا سلائی جلا کر اُسے روشن کیا۔ جیسے ہی وہ لالٹین جلی اس کی روشنی میں میں نے اُس عورت کا چہرہ دیکھا جس پر سے آنچل اب ڈھلک گیا تھا۔ وہ چہرہ مجھے آج تک اچھی طرح یاد ہے۔ میں اُسے کبھی نہیں بھول سکتا۔ پیلا، بیمار چہرہ، پچکے ہوئے گال دھنسی ہوئی آنکھیں۔ بال پریشان اور دھول سے اٹے ہوئے۔ ہاتھ جس سے وہ لالٹین کی بتی کو اونچا کر رہی تھی کمزوری سے کانپ رہا تھا۔ مگر اسی لالٹین کی طرح وہ چہرہ بھی ایک اندرونی روشنی سے منور تھا۔ نیلے سوکھے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں ایک عجیب چمک، انتظار کی چمک، اُمید کی چمک، اعتقاد کی چمک۔ ایسی چمک جو بھجن کرتے وقت کسی جوگن کی آنکھوں میں ہو سکتی ہے، کسی شہید کی آنکھوں میں یا کسی محبت کرنے والی کی آنکھوں میں جو اپنے عاشق سے بہت جلد ملنے کا انتظار کر رہی ہو!

ضرور وہ بھی اپنے محبوب کی منتظر تھی۔ کم سے کم مجھے اس کا یقین ہو گیا۔
میں نے دیکھا کہ اُس نے اپنی کشتی گھمائی اور جس خاموشی سے آئی تھی اسی طرح
دھیرے دھیرے چپّو چلاتی ہوئی ایک ٹاپو کی طرف چلی گئی۔ جہاں ستاروں کی
روشنی میں ماہی گیروں کے جھونپڑے دُھندلے دُھندلے نظر آرہے تھے۔ اب
وہ گا رہی تھی۔ ملیالی زبان کا کوئی لوک گیت۔ انجانا مگر پھر بھی جانا بوجھا جس کے
الفاظ کو میں نہ سمجھ سکتا تھا مگر ایسا لگتا تھا۔ جیسے یہ گیت میں نے پہلے بھی
کسی اور زبان میں سُنا ہو۔

"وہ کیا گا رہی ہے؟" میں نے پوچھا۔

اور مانجھی نے جواب دیا۔ "یہ ہم لوگوں کا پُرانا گیت ہے صاحب۔
عورتیں اپنے پریمیوں کے انتظار میں گاتی ہیں۔ میں ساری رات دیا جلائے تیری
باٹ دیکھتی رہی ہوں، تو کب آئے گا ساجن؟"

اور مجھے اپنے ہاں کا لوک گیت 'دیا جلے ساری رات' یاد آگیا جو ہمارے
ہاں عورتیں بھی ایسے موقعہ پر ہی گاتی ہیں۔ "کیا ساری دنیا کی عورتوں کے من
میں سے ایک ہی آواز اُٹھتی ہے؟" میں نے سوچا اور پھر مانجھی سے کہا "تو
اسی لیئے وہ یہاں لالٹین جلانے آئی تھی؟ تاکہ اس کا پتی یا پریمی رات کو
لوٹے تو اندھیرے سمندر میں راستہ نہ کھو بیٹھے؟"

مانجھی نے کوئی جواب نہ دیا۔

میں نے پھر سوال کیا "کیا اس کا پریمی آج کی رات آنے والا ہے؟"
اندھیرے میں مانجھی کی آواز ایسی آئی جیسے وہ کسی بڑے دکھ کے احساس

سے بوجھل ہو: "نہیں وہ نہیں آئے گا۔ نہ آج رات نہ کل رات۔ وہ مر چکا ہے۔ کئی برس ہوئے، مر چکا ہے۔"

میں کچھ نہ سمجھ سکا اور تعجب سے پوچھا "کیا مطلب؟ کیا اس عورت کو نہیں معلوم کہ اس کا پریمی مر چکا ہے اور اب کبھی نہ لوٹے گا؟"

"وہ جانتی ہے —— شاید۔ مگر وہ مانتی نہیں۔ وہ اب تک انتظار میں ہے...... اُس نے اُمید نہیں چھوڑی....."

"اور کئی برس سے وہ ہر رات یہاں آتی ہے اور یہ لالٹین جلاتی ہے۔ تاکہ اس کے پریمی کی کشتی اندھیرے میں راستہ پا سکے؟" میں نے کہا۔ مانجھی سے نہیں اپنے آپ سے۔ اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ آج میں نے اپنی آنکھوں سے امر پریم کی ایک جھلک دیکھی ہے۔ ایسا پریم جو قصّے کہانیوں میں پڑھنے میں آتا ہے۔ زندگی میں کبھی کبھار ہی ملتا ہے۔ میری افسانہ نگاری کی حس دفعتاً بیدار ہو گئی تھی۔ اور ایک سوال کے بعد دوسرا سوال کر کے میں نے مانجھی کی زبانی پوری کہانی سُن لی۔

یہ کہانی پریم کہانی بھی تھی اور ہندوستان کی جنگِ آزادی کی ایک روح پرور داستان بھی۔ سن ۱۹۴۲ء میں جب سارے ملک میں انقلابی طوفان آیا تو ٹراونکور کے عوام۔ طالب علم، مزدور، کسان —— یہاں تک کہ مانجھی اور ماہی گیر بھی —— اپنے جمہوری حقوق کے لئے راجہ شاہی کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ کوچی ٹون کے کئی ہزار مانجھیوں نے ہڑتال کی اور اعلان کر دیا کہ ہم کام پر نہیں جائیں گے۔ چاہے اس سمندر کا رنگ ہمارے خون سے

لال ہی کیوں نہ ہو جائے۔

اَن پڑھ مانجھی کی زبانی یہ جوشیلے الفاظ سُن کر میں نے پوچھا "مانجھیوں کی طرف سے یہ اعلان کس نے کیا تھا؟"

"اُس نے، صاحب، اُس نے!"

"اُس نے؟ کس نے؟"

"کرشنا نے، صاحب، ہم مانجھیوں کا لیڈر وہی تو تھا۔ تھا تو ذات کا مانجھی اور ہماری طرح کشتی ہی چلاتا تھا۔ مگر اسکول میں پڑھا ہوا تھا اور کئی سال ٹریونڈرم شہر میں رہا تھا جہاں اُس نے بڑے بڑے لیڈروں کی تقریریں سُنی تھیں۔ وہ خود بھی لیڈروں کی طرح بھاشن دے لیتا تھا صاحب بڑا خوبصورت اور تگڑا جوان تھا۔ کوئی لون سے اس ٹاپو تک تین میل تیر کر اپنی رادھا سے ملنے آیا کرتا تھا......"

"کرشنا اور رادھا! رادھا اور کرشنا! یہ تو بالکل کہانی ہی بن گئی" میں نے تعجب سے کہا۔

"اصل میں اُس کا نام رادھا نہیں ہے صاحب، مگر کرشنا اسے رادھا رادھا کہہ کر ہی پکارتا تھا۔ سو اور بھی سب اُسے رادھا ہی کہنے لگے۔ رادھا اور کرشنا۔ سب مانجھی کہتے تھے ایسا سُندر جوڑا دور دور ڈھونڈے سے نہ ملے گا۔ جب اُن دونوں کی منگنی ہوئی تو سب ہی بہت خوش ہوئے سوائے......"

اور اتنا کہہ کر وہ رُک گیا۔ اور کچھ دیر پھیلی ہوئی خاموشی میں صرف اس کے

چپّو چلنے کی آواز آتی رہی۔

"سوائے؟" میں نے لقمہ دیا۔

"سوائے اُن کے جو خود رادھا کو بیاہنا چاہتے تھے"۔ اور یہ کہہ کر ایک بار پھر وہ خاموش ہو گیا۔

"یہ رادھا......" میں نے گفتگو کا سلسلہ پھر چلانے کے لئے کہا" یہ رادھا۔ آٹھ برس پہلے کافی خوب صورت رہی ہو گی؟"

ایک ٹھنڈی سانس لے کر وہ بولا:" خوب صورت؟ بہت خوب صورت، صاحب آس پاس کے گاؤں میں کیا کوئی لون میں بھی کوئی لڑکی اتنی سُندر نہیں تھی۔ ناریل کے پیڑ کی طرح لمبی اور دُبلی۔ مچھلی جیسا سڈول اور چمکدار جسم تھا اُس کا۔ اور اُس کی آنکھیں — اُس کی آنکھیں۔ اس سمندر کی ساری گہرائی اور ساری خوب صورتی تھی اُن میں .....؟"

میں نے سوچا۔ کہانی سے ہٹ کر ہم شاعرانہ مبالغوں میں پھنستے جا رہے ہیں۔ مجھے رادھا کی خوب صورتی کے بیان میں اتنی دلچسپی نہ تھی جتنی کرشنا کے انجام میں۔ اس لئے میں نے "اور پھر کیا ہوا؟" کہہ کر گفتگو کا رُخ پھر واقعات کی طرف پھیرنا چاہا۔

"پھر کیا ہونا تھا، صاحب۔ کرشنا کی اس جوشیلی تقریر کے بعد تو پولیس اس کے پیچھے ہی پڑ گئی۔ اس کے لئے، بڑے بڑے جال بچھائے، انھوں نے۔ مگر وہ ان کے ہاتھ نہ آیا۔ چھُپ کر کام کرتا رہا۔ پولیس والے دن بھر اس کی تلاش میں مارے مارے پھرتے مگر انھیں یہ نہیں معلوم تھا کہ

ہر رات کو اسی اندھیرے سمندر میں تیرتا ہوا وہ رادھا سے ملنے اُس کے ٹاپو تک جاتا اور سویرا ہونے سے پہلے پھر تیرتا ہوا واپس آجاتا۔ اور سب پولیس کا ٹھٹھا اُڑاتے اور کہتے ہمارا کرشنا کبھی ان پولیس والوں کے ہاتھ آنے والا نہیں ہے۔"

"تو سارے مانجھی کرشنا کے طرفدار تھے؟"

"ہاں صاحب سبھی اس کے ساتھی تھے، سوائے اُن کے........" اور ایک بار پھر اُس کی زبان رُک گئی۔

"سوائے کن کے؟"

"جو رادھا کی وجہ سے اُس سے جلتے تھے صاحب۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"چاند ڈھلتا گیا صاحب، اور جب اندھیری راتیں آئیں تو ہر رات کو اپنے کرشنا کو راستہ دکھانے کے لئے سمندر کے بیچ میں رادھا یہ لالٹین جلانے لگی۔ ہر شام کو وہ اسی طرح سے جیسے وہ آج آئی تھی کشتی میں اس جگہ آتی، اور لالٹین جلا کر واپس ہو جاتی۔"

میں نے جب پیچھے مڑ کر اندھیرے سمندر میں اس ننھی روشنی کو ٹمٹماتے ہوئے دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ایک بار پھر بہادر کرشنا اپنے مضبوط بازوؤں سے پانی کو چیرتا ہوا اپنی رادھا سے ملنے جا رہا ہے۔

"اور پھر کیا ہوا؟"

"ایک رات رادھا نے لالٹین جلائی مگر وہ بجھ گئی اور جب کرشنا رات

کو تیرتا ہوا آیا تو اس کو راستہ دکھانے کے لیے کوئی روشنی نہ تھی۔"

"کیوں کیا ہوا؟ کیا کوئی طوفان آیا تھا؟"

"ہاں یہی سمجھیے کہ ایک طوفان آیا ـــ مگر یہ طوفان سمندر میں نہیں ایک بے ایمان آدمی کے من میں اُٹھا تھا۔ اُس نے اپنی قوم کو دغا دی اور لالٹین بجھا کر اپنے دوست کی موت کا باعث ہوا۔"

"مگر کیوں؟ کوئی انسان ایسی کمینی اور بے کار حرکت کیسے کر سکتا ہے؟"

"محبّت کی خاطر ـــ کم سے کم وہ یہی سمجھتا تھا صاحب ـ پر اس کی محبّت اندھی تھی۔ محبّت کیا ایک بیماری تھی۔ پریم، نہیں ایک پاگل پن تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رادھا کرشنا کے سوا کسی دوسرے کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی۔ سو اُس نے کرشنا کو ـــ اپنے دوست کو ـــ قتل کر دیا......"

"تو کرشنا ڈوبا نہیں قتل کیا گیا تھا؟"

"اُس رات کو وہ لالٹین بجھانا کرشنا کو قتل کرنے کے برابر ہی تھا، صاحب۔ پر قاتل کو یہ نہیں معلوم تھا کہ کرشنا کی موت سے اُس کا کوئی بھلا نہ ہوگا۔ بلکہ اُس کا بھیانک جُرم بھوت بن کر اُس کے من میں ہمیشہ منڈلاتا رہے گا۔ اُس کا دن کا چین اور رات نیند اُڑا دے گا۔"

اب ہماری کشتی کوئی لون کی بندرگاہ کے پاس پہنچ گئی تھی اور میں کہانی اور اس کے سب کرداروں کا انجام جاننا چاہتا تھا۔

"سو اُس رات کو کرشنا ڈوب کر مر گیا۔ پھر کیا ہوا؟"

"کرشنا کے بغیر مانجھیوں کا ایکا نہ رہا۔ پولیس کے ڈر سے انھوں نے ہڑتال ختم کر دی۔"

"اور رادھا؟ جب اُس نے کرشنا کی موت کی خبر سُنی تو اُس نے کیا کیا؟"

"آج تک اُسے کرشنا کی موت کا یقین ہی نہیں آیا۔ بات یہ ہے کہ کرشنا کی لاش آج تک سمندر سے نہیں نکلی۔ سو آج تک ہر شام کو رادھا دیے ہی کشتی میں آتی ہے، لالٹین جلاتی ہے اور واپس جا کر رات بھر اپنے جھونپڑے کے سامنے بیٹھی کرشنا کا انتظار کرتی رہتی ہے۔"

"اور اُس غدار کا کیا ہوا؟ وہ پاجی جس نے کرشنا کو موت کے گھاٹ اُتارا اور اپنے لوگوں اور اُن کی جنگِ آزادی کے ساتھ غدّاری کی۔ اس کا کیا حشر ہوا۔ وہ اب کیا کرتا ہے؟"

مانجھی نے میرے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ پیٹھ موڑے، کندھے اور سر جھکائے، وہ چپ چاپ بیٹھا چپّو چلاتا رہا۔ مگر اس کی خاموشی میں اس کے مجرم ضمیر کی دھڑکن تھی۔ اُس وقت ساری کائنات پر سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ موت کی طرح گہرا سنّاٹا۔ مگر ریل کی سیٹی نے مجھے چونکا دیا۔ میں اُسی رات کو کوئی لون کو خیر باد کہنے والا تھا۔

کشتی سے اُترنے سے پہلے میں نے ایک بار پھر سمندر کی طرف نگاہ کی، آسمان پر اب ہزاروں ستارے جگمگا رہے۔ مگر ایک ستارہ اندھیرے سمندر کے بیچ میں چمک رہا تھا۔ یہ رادھا کی لالٹین تھی جو اُس کے

کرشنا کا انتظار کرتی رہے گی۔ آج کی رات ــــ اور کل کی رات ....
اور پھر پرسوں کی رات....... رادھا کی محبت کی طرح ہمیشہ چمکتا رہے گا۔
اس لیے کہ یہ اُمید کا ستارہ ہے۔

روپے۔ آنے۔ پائی

(ایک آمدنی اور خرچ کی کاپی کے کچھ پھٹے ہوئے ورق جو ردّی والے کی دُکان کے سامنے پڑے ہوئے کوڑے کے ڈھیر پر سے اُٹھائے گئے)

پہلی جنوری ۱۹۵۳ء

آمدنی

لکھمن لال ساہوکار سے مکان گروی رکھ کر ۵۰۰ — ۰ — ۰

خرچ

ماں کو گھر کے خرچ کے لئے ۲۰۰ — ۰ — ۰

حساب کی کاپی ۰ — ۶ — ۰

بی۔ اے کی ڈگری کے لئے شیشے کا فریم ۱ — ۴ — ۰

درزی کو کپڑوں کی سلائی ۴۵ — ۰ — ۰

سٹیشن تک تانگے کا کرایہ ۱ — ۸ — ۰

ریل کا ٹکٹ لکھنؤ سے بمبئی تک اِنٹر کلاس ۔۔۔ ۵۵ — ۰ — ۰

قلی ۔۔۔ ۰ — ۸ — ۰

ریلوے بک سٹال سے کتابیں (فلمی پریوں کی کہانیاں
جوانی دیوانی ۔ گناہ کی راتیں ۔ زہرِ عشق ۔) ۔۔۔ ۱۰ — ۱۰ — ۰

راستے میں پڑھنے کے لئے رسالے اور میگزین
(سکرین ۔ فلم فیر ۔ شمع ۔ مستانہ جوگی) ۔۔۔ ۲ — ۰ — ۰

چائے اور کیک ۔۔۔ ۰ — ۱۰ — ۰

سگرٹ کا ڈبہ (گولڈ فلیک) ۔۔۔ ۳ — ۲ — ۰

جھانسی میں رات کا کھانا ۔ اپنے اور ساتھ سفر
کرنے والی لڑکی کے لئے ۔۔۔ ۳ — ۱۲ — ۰

۴ جنوری ۱۹۵۲ء

آمدنی

گھر میں سے لائے ہوئے روپوں میں سے باقی ۔۔۔ ۱۵ — ۰ — ۰

شیر خاں پٹھان سے قرض ۔۔۔ ۲۰۰ — ۰ — ۰

کل جمع ۔۔۔ ۲۱۵ — ۰ — ۰

خرچ

شیر خاں پٹھان کو مہینے بھر کا سود پیشگی ۔۔۔ ۲۰ — ۰ — ۰

ہوٹل کا باقی کرایہ ۔۔۔ ۲۵ — ۰ — ۰

کمرے کے لئے پگڑی ۔۔۔ ۱۰۰ — ۰ — ۰

ایک پلنگ ۔ ایک کرسی ۔ ایک میز	۴۰ — ۰ — ۰
ایمپلائمنٹ ایکسچینج تک بس کا کرایہ	۰ — ۴ — ۰
ایمپلائمنٹ ایکسچینج سے امریکن آئل کمپنی کے دفتر تک ٹیکسی	۱ — ۲ — ۰
چپراسی کو بخشش	۱ — ۰ — ۰
ہیڈ کلرک کو نذر	۱۰ — ۰ — ۰
سگرٹ کا پیکٹ (کیپسٹن)	۰ — ۱۰ — ۰
ناولٹی سینما تک بس کا کرایہ	۰ — ۲ — ۰
سینما کا ٹکٹ (انارکلی)	۱ — ۵ — ۰
انٹرول میں آئس کریم (دو کیلئے)	۱ — ۸ — ۰
دو بس کے ٹکٹ پریل تک	۰ — ۸ — ۰
پھول اور بالوں میں لگانے کی بینی	۰ — ۸ — ۰
رات کا کھانا	۱ — ۴ — ۰

یکم مارچ ۱۹۵۳ء

آمدنی

دفتر سے تنخواہ بیس دن کی	۸۵ — ۰ — ۰

خرچ

کمرے کا کرایہ	۲۵ — ۰ — ۰
بجلی اور نل	۲ — ۸ — ۰

ریل کا پاس	۰	۴	۵
دھوبی پچیس کپڑے	۰	۲	۲
اخبار و الا (سکرین۔ ٹائمز۔ فلم فیر۔ شمع)	۰	۲	۷
نائی۔ حجامت۔ شیو۔ شیمپو اور فیس مساج	۰	۱۲	۱
نائی کو انعام	۰	۴	۰
پوری بھاجی	۰	۸	۰
کتابیں	۰	۱۰	۴
ٹیلیفون (آشا کو)	۰	۲	۰
دو ٹکٹ سینما (انار کلی)	۰	۱۰	۲
آئس کریم	۰	۸	۱
ہوٹل کے بیرے کو انعام	۰	۴	۰
ٹیکسی گرانٹ روڈ سے مالا بار ہل تک	۰	۱۲	۱
ڈنر (دو کے لئے)	۰	۸	۴
پھول اور بالوں میں لگانے کی پِن، آشا کے لئے	۰	۸	۰
ٹیکسی مالا بار ہل سے آشا کے گھر تک	۰	۸	۲
بس کا کرایہ	۰	۴	۰
سیاہی کی بوتل	۰	۱۲	۰
کیلنڈر	۰	۶	۰

۲ر جون ۱۹۵۳ء

آمدنی

دفتر سے نوٹس کے مہینے کا	۱۰۵ — ۰ — ۰

خرچ

کمرے کا کرایہ	۲۵ — ۰ — ۰
بجلی اور نل	۲ — ۸ — ۰
دھوبی ۱۴ کپڑے	۱ — ۱۲ — ۰
پٹھان کے قرض کا سود	۲۰ — ۰ — ۰
اخبار والا	۱ — ۱۲ — ۰
ٹرام کا کرایہ	۰ — ۲ — ۰
ریل کا پاس	۵ — ۴ — ۰
دوپہر کا کھانا	۰ — ۱۰ — ۰
چائے	۰ — ۶ — ۰
سیکنڈ ہینڈ کتابیں	۱ — ۴ — ۰
دو ٹکٹ سینما (انارکلی)	۲ — ۱۰ — ۰
دو کوکا کولا	۰ — ۸ — ۰
بس کا کرایہ	۰ — ۸ — ۰
سگرٹ (چارمینار)	۰ — ۲ — ۰

۱۵ اکتوبر ۱۹۵۲ء

<u>آمدنی</u>

شیر خان پٹھان سے نیا قرض ۔۔۔ ۲۰۰ —— ۰ —— ۰

<u>خرچ</u>

پٹھان کو ماہوار سود پیشگی پورے قرض پر ۔۔۔ ۴۰ —— ۰ —— ۰

ماں کے نام منی آرڈر ۔۔۔ ۲۵ —— ۰ —— ۰

منی آرڈر کی فیس ۔۔۔ ۰ —— ۶ —— ۰

اخبار (ٹائمز آف انڈیا) ۔۔۔ ۰ —— ۲ —— ۶

رائٹنگ پیڈ اور لفافے ۔۔۔ ۰ —— ۱۲ —— ۰

ٹکٹ ڈاک (نوکری کے لئے بیس عرضیوں پر) ۔۔۔ ۲ —— ۸ —— ۰

ناشتہ اور دوپہر کا کھانا ۔۔۔ ۰ —— ۸ —— ۰

بس، ایمپلائمنٹ ایکسچینج تک ۔۔۔ ۰ —— ۴ —— ۰

ٹرام، ایمپلائمنٹ ایکسچینج سے واپسی پر ۔۔۔ ۰ —— ۲ —— ۰

لنڈنگ لائبریری سے کتاب کا کرایہ ۔۔۔ ۰ —— ۳ —— ۰

چائے ۔۔۔ ۰ —— ۱ —— ۰

بیڑی کا بنڈل ۔۔۔ ۰ —— ۲ —— ۰

ٹیلی فون (آشا کو) ۔۔۔ ۰ —— ۲ —— ۰

دو ٹکٹ سینما (انارکلی) ۔۔۔ ۲ —— ۱۰ —— ۰

چنے، مونگ پھلی ۔۔۔ ۰ —— ۴ —— ۰

دو سپیشل چائے	۰ — ۸ — ۰
ٹرام کا ٹکٹ	۰ — ۲ — ۰
بالوں میں لگانے کی پنی	۰ — ۴ — ۰
رات کا کھانا	۰ — ۶ — ۰

۱۲؍ دسمبر ۱۹۵۲ء

آمدنی

اخباروں، رسالوں اور کتابوں کی قیمت	
ردی والے سے	۳ — ۷ — ۰
قیمت کرسی، میز اور پلنگ (چور بازار میں)	
سیکنڈ ہینڈ فرنیچر کی دکان سے	۱۱ — ۸ —
پرانے کپڑوں کی بکری سے	۱۲ — ۰ — ۰
	۲۷ — ۱۵ — ۰

خرچ

ٹیلیفون آشا کو	۰ — ۲ — ۰
دو ٹکٹ سینما (انارکلی)	۴ — ۸ — ۰
ٹیکسی اپالو بندر تک	۲ — ۴ — ۰
ڈنر دو کے لئے	۱۰ — ۸ — ۰
ویٹر کو انعام	۲ — ۸ — ۰
پھول اور بالوں میں لگانے کی پنی	۰ — ۸ — ۰

پھول والے کو بخشش	۰	۸	۰
مہوبے کے پان	۰	۸	۰
پان والے کو بخشش	۰	۸	۰
ٹیکسی، آشا کے گھر تک	۰	۴	۲
ٹیکسی والے کو بخشش	۰	۱۲	۰
آشا کے نام خط، ڈاک سے	۰	۲	۰
سونے کی دوا (پوری بوتل)	۰	۱۲	۲
بھکاری کو بخشش	۰	۱	۰
	۰	۱۵	۲۷
بقایا	۰	۰	۰

چراغ تلے اندھیرا

(۱)

راکھشس کا سہرا

پچیس جنوری کی شام تھی اور سارے شہر میں آزادی کی دیوالی منائی جانے والی تھی۔ ہر بڑی عمارت کو بجلی کے قمقموں کے جگمگاتے ہوئے ہار پہنائے جانے والے تھے۔

گھنٹہ گھر کے چاروں طرف لکڑی کی بلیوں اور بانسوں کی پاڑ بندھی ہوئی تھی جو دور سے ایسی لگتی تھی جیسے کسی راکھشس کا پنجر جس کی پسلیاں اور ہڈیاں بدن سے باہر نکل آئی ہوں اور ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں اس راکھشس کے چہرے یعنی گھنٹہ گھر کے ڈائل پر بھی موت کی زردی چھا چکی تھی۔ کام ختم ہو گیا تھا۔ سب مزدور اپنا کام پورا کر کے، اپنی مزدوری لے کر اپنے اپنے گھر جا چکے تھے۔ اب صرف ایک مزدور رہ گیا تھا جو نیچے دیکھنے پر ایسا لگتا تھا جیسے راکھشس کے مُردہ چہرہ پر کوئی کیڑا رینگ رہا ہو۔

سڑک سے سیکڑوں فٹ کی اونچائی پر پاڑ کی بلیوں میں وہ بندر کی

طرح ٹنگا ہوا تھا۔

آخری بلب کو اس کے خانے میں لگا کر وہ سانس لینے کے لیے رُکا۔ سامنے ہی گھنٹے کا جناتی چہرہ اس کا منہ چڑا رہا تھا اور اس پر کئی فٹ لمبی سوئیاں ایک شانِ بے نیازی سے ایک دوسرے کا پیچھا کر رہی تھیں۔ اتنے پاس سے گھنٹے کے چلنے کی آواز کتنی ڈراؤنی لگتی تھی۔ جیسے کسی لاؤڈ سپیکر میں خود اس کے دل کی دھڑکن سنائی دے رہی ہو۔

نیچے اُترنے سے پہلے اُس نے ایک بار نگاہ اوپر کی۔ بجلی کے تاروں کے گجرے گھنٹہ گھر کی چوٹی پر لپیٹے ہوئے تھے اور ان کی لڑیاں نیچے تک لٹکی ہوئی تھیں۔ ایک مردہ راکھشس کو سہرا پہنا کر دولھا بنایا جا رہا تھا۔ مگر بجلی کے پھول کھلنے میں ابھی دیر تھی۔ گھنٹہ گھر کی چوٹی کے اوپر دو سفید بادلوں کے ٹکڑے نیلے آسمان میں تیر رہے تھے۔ اور کوؤں کی ایک ڈلی اس کے اوپر سے کائیں کائیں کرتی ہوئی گزر رہی تھی۔ اس کے اتنے پاس سے کہ وہ اُڑتے ہوئے کوؤں کے نرم کالے پروں کی چمک اور ان کی نوکیلی چونچوں کی دھار کو دیکھ سکتا تھا۔ اس ہوا کے جھونکے کو اپنے محنت سے تمتمائے ہوئے چہرے پر محسوس کر سکتا تھا۔ جو اُن کے پروں کی مار سے پیدا ہوا تھا۔ یکایک اُسے اس خیال نے گدگدایا کہ اس وقت وہ سارے شہر میں سب سے اونچی جگہ پر بیٹھا ہوا ہے۔ امیروں، رئیسوں، مل مالکوں، پونجی پتیوں، نیتاؤں اور افسروں، راجوں، مہاراجوں، سنت سادھوؤں، ودوانوں سب سے اونچا استھان آج اس کا ہے۔ دو روپے پانے والے ایک مزدور کا! اور بھلا

کس کی ہمّت ہو سکتی ہے کہ وہ جان پر کھیل کر گھنٹہ گھر کی چوٹی تک یوں چڑھ جائے ،،

اس نے اپنی گردن موڑی اور اس کی نگاہ میدان کے درختوں کی چوٹیوں اور میرین ڈرائیو کے شاندار مکانوں کی چھتوں پر سے ہوتی ہوئی نیلے سمندر تک پہونچ گئی۔ جہاں سورج کی آتشیں گیند دھیرے دھیرے پانی میں ڈوب رہی تھی۔ اتنا خوبصورت اور شاندار نظارا بھلا اور کسی کو نصیب ہوا ہے! یہ سوچ کر اس نے نیچے سڑک کی طرف نگاہ کی۔ جہاں آتے جاتے مرد اور عورتیں گڑیوں جیسے لگتے تھے۔ اور موٹریں بچّوں کے کھلونے۔ ایک لمحہ کے لئے وہ یہ دیکھ کر مسکرا دیا اور اس کا دل گھمنڈ سے بھر گیا۔ نہ صرف اپنی ہمّت اور بے جگری پر گھمنڈ بلکہ اپنے گٹھے ہوئے بدن کے انگ انگ پر گھمنڈ...... اپنے فولادی ہاتھوں پر اور اپنے پھرتیلے پیروں پر گھمنڈ جن کے سہارے وہ یہاں تک چڑھ پایا تھا۔

اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس وقت وہ دُنیا میں سب سے بڑا، سب سے اہم، سب سے طاقتور انسان ہے۔ اور باقی سب لوگ۔ یہ موٹروں والے اور ریشمی کپڑوں والے اور رنگین ساڑھیوں والیاں۔ اس کے سامنے کوئی ہستی نہیں رکھتے۔

مگر گھمنڈ کے ساتھ ساتھ ایک بے نام سا ڈر بھی رینگتا ہوا اس کے دل میں پہنچ گیا! ور اتنی اونچائی سے نیچے کی طرف دیکھتے دیکھتے اس کا سر چکرانے لگا۔ اور جو نیچے جاتے ہوئے اس کا پیر پھسل جائے ہاتھ کی گرفت

ڈھیلی پڑ جائے ؟ یا بلیوں کے جوڑوں پر بندھی ہوئی کسی رسّی کی ایک گرہ کھل جائے ؟
......تو کیا ایک لمحہ میں اس کالی، پتھریلی، ڈراؤنی سڑک پر گر کر اس کے مضبوط
گٹھے ہوئے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائیں گے ؟ دور نیچے سڑک پر موت اس کا
کتنی بے چینی سے انتظار کر رہی تھی !

ایسا ڈر اُسے کئی بار پہلے بھی لگا تھا۔ مگر آج ڈر کے ساتھ ساتھ ایک نیا
احساس بھی تھا۔ جب شہر کے سب لوگ ہنستے کھیلتے زمین پر پھر رہے ہیں جشن
منا رہے ہیں، تو وہ کیوں بندر کی طرح اتنی اونچائی پر ٹنگا ہوا ہے ؟ اس نے
ہی اپنی جان کو کیوں خطرے میں ڈالا ؟ صرف دو روپے کے لئے جو ٹھیکیدار
اسے دے گا۔ اگر وہ صحیح سلامت نیچے اُتر گیا ! نہیں تو روپے بھی گئے اور جان
بھی گئی۔ دو روپے اور ایک جان ! کتنی سستی بازی تھی۔ اس کی آنکھوں
کے سامنے تاش کے پتّے گھومنے لگے۔ اِکے۔ نہلے۔ دہلے۔ بادشاہ بیگم۔
اور غلام بادشاہ اور غلام، غلام اور بادشاہ ! اور اس کا جی چاہا کہ وہیں کھڑے ہو کر چلّانے لگے
اور نیچے آنے جانے والوں سے پوچھے ! کیوں ؟ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے ؟
بادشاہوں کے لئے رنگ رلیاں اور غلاموں کے لئے محنت، مزدوری اور
موت ؟ کوئی اپنی جان کو خطرے میں ڈالے اور کوئی مزے اُڑائے۔ کوئی
گھنٹہ گھر کی چوٹی پر بندر کی طرح چڑھ کر بلب لگائے اور کوئی بس ایک بٹن
دباتے ہی ان لاکھوں بتیوں کو جگمگا کر یہ نئی دیوالی منائے ؟ یہ اونچ نیچ۔ یہ
بھید بھاؤ۔ یہ انیائے۔ آخر کیوں ؟ کیوں ؟ کیوں ؟ ...... اس ایک لفظ
کی تکرار سے اس کے دماغ میں ایک خطرناک انقلابی گیت گونج اُٹھا۔

خوف کا لمحہ ...... غصے اور جوش کا لمحہ۔ گزر گیا ...... اس کی زندگی میں نہ جانے کتنی بار یہ لمحہ آیا تھا اور گزر گیا تھا ...... اور دو ٹانگ کا بندر ایک بلّی سے دوسری بلّی پر پاؤں دھرتا ہوا، اپنے فولادی ہاتھوں اور مضبوط ٹانگوں اور گٹھے ہوئے پٹھوں کے سہارے نیچے اتر آیا۔ صرف ایک بار بس آدھے سیکنڈ کے لئے اس کا دل چلتے چلتے رک گیا۔ جب پسینے کی وجہ سے اس کا بایاں ہاتھ ایک بلّی کی چکنی گولائی پر سے پھسلا۔ مگر فوراً آپ سے آپ اس کے داہنے ہاتھ کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ اس کے بازوؤں اور ٹانگوں کے پٹھے تن گئے، اور اس کے ننگے پاؤں بلّی کے پنجوں کی طرح نیچے کی بلّی میں گڑ گئے ...... خطرے کا لمحہ بھی گزر گیا اور وہ نیچے زمین پر اتر آیا۔

ٹھیکیدار نے اسے مزدوری کے دو روپے بھی دے دیئے۔ مگر مزدور کچھ دیر ٹھیرا رہا۔ وہیں گھنٹہ گھر کے سامنے۔ سچی بات یہ تھی کہ اس نے صرف دو روپے کے لئے ہی اپنی جان ایسے خطرے میں نہ ڈالی تھی۔ اس کو ایک اور انعام بھی چاہئے تھا اور وہ اسے مل گیا۔ جب اندھیرا ہوتے ہی لاکھوں روشنیاں یکا یک جگمگا اٹھیں۔ یہ ایک نئی دیوالی کی دیپ مالا تھی۔ یہ معمولی چراغاں نہیں تھا بلکہ اندھیرے آسمان پر چمکتے ہوئے حروف میں آزادی کا اعلان تھا۔ جمہوریت کا آئین تھا۔ اور ان لاکھوں جگمگاتی ہوئی بتیوں میں وہ سیکڑوں بتیاں بھی تھیں جو اس نے اپنے ہاتھ سے لگائی تھیں یہی اس کا انعام تھا۔ اس نے سوچا اس تاریخی جشن میں میرا بھی حصہ ہے۔ یہ جگمگاتا ہوا گھنٹہ گھر، یہ نور کا مینار، یہ ساری روشنیاں، یہ زندگی، یہ چہل پہل، یہ آزادی،

یہ جمہوریت، یہ نیا ہندوستان، یہ سب میرے دم سے ہے ...... میرے دم سے ...... میرے دم سے........ میرے .....

مسکراتا، ہنستا، بھیڑ بھاڑ میں سے گزرتا ہوا ایک عجیب نشے میں چور، وہ اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ ریلیں، ٹرامیں، بسیں سب کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ کوئی سواری ملنا ناممکن تھا۔ سو پیدل ہی وہ کالبا دیوی، بائیکلہ، لال باغ ہوتا ہوا پریل پہنچ گیا۔ ہر سڑک پر بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ہر بلڈنگ نیچے سے اوپر تک روشنیوں سے جگمگا رہی تھیں...... روشنیاں جو اس نے یا اس جیسے دوسرے مزدوروں نے لگائی تھیں۔ جن کے لئے اس جیسے مزدوروں نے اپنی جانیں جوکھوں میں ڈالی تھیں...... سڑکوں پر لوگ روشنیاں دیکھنے کے لئے نکلے ہوئے تھے۔ وہ خوش تھے۔ ہنس رہے تھے۔ گا رہے تھے اور اس کا دل بھی گا رہا تھا۔

پریل کے پل سے جب اس نے سارے شہر کو جگمگاتے ہوئے دیکھا تو اس نے سوچا کہ یہ لاکھوں کروڑوں روشنیاں ایسی لگی ہیں جیسے رات کی کالی شہزادی کو موتیا کے سفید پھولوں کے گجرے پہنا دیئے گئے ہوں۔ اور پھر اپنے شاعرانہ تخیل پر وہ خود ہی شرما سا گیا۔ مگر اس نے سوچا۔ گھر جا کر یہ بات اپنی گوری کو بتاؤں گا۔ وہ یہ سن کر بہت خوش ہوگی۔......

مگر یہ بات اس کے من ہی میں رہی اور وہ گوری کو نہ بتا سکا......
کیوں کہ جس تنگ گلی میں ان کی چال تھی وہاں آزادی کی روشنی نہ پہنچی تھی۔ وہاں تو بس ایک گیس کی بتی اپنا پیلا بسورتا ہوا منہ لئے ٹمٹما رہی تھی۔ سڑکوں

اور بازاروں کی جگمگاہٹ کے بعد اس گلی کی مدھم روشنی اسے اندھیرا ہی لگی۔
آنکھیں جھپکاتا، راستہ ٹٹولتا، اپنی چال تک پہنچا۔ بدبودار سیڑھیوں پر
گھُپ اندھیرا تھا اور ان پر چڑھنا اُسے گھنٹہ گھر کی مچان پر چڑھنے سے بھی
زیادہ خطرناک لگا۔ کئی دوسرے کمروں میں مٹّی کے تیل کی بتّیاں دھوئیں سے
گھری ہوئی جل رہی تھیں۔ مگر خود اس کے کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس کی بیوی
نے کہا "آج بازار میں تیل نہیں ملا۔"

اور اسی لمحے میں وہ کالی شاہزادی کے گلے میں موتیا کے گجرے والی
خوب صورت تشبیہ کو بھول گیا جو وہ راستے بھر اپنی بیوی کو بتانے کے لئے
سوچتا آیا تھا۔ یکایک اُسے اُن لاکھوں کروڑوں بجلی کی بتّیوں کا دھیان آیا
جو سارے شہر میں وہ ابھی دیکھتا چلا آرہا تھا۔ اور پھر اسے یاد آیا کہ ان کی اپنی
چال میں بجلی کی ایک بتّی بھی نہیں تھی۔ کیوں؟ اس لئے کہ میونسپلٹی کا کہنا تھا کہ
بجلی شہر کی ساری ضروریات کے لئے کافی نہیں ہے۔ اس لئے کتنی ہی چالوں کو
اندھیرے میں رہنا پڑے گا۔

دور، بہت دور، سارا شہر جشنِ جمہوریت منا رہا تھا۔ کروڑوں روشنیاں
آزادی اور جمہوریت کا اعلان کر رہی تھیں۔ مگر اس چال کے رہنے والوں کے لئے
وہ روشنیاں اتنی ہی خوب صورت مگر اتنی ہی بے کار تھیں جیسے کسی رانگشش
کے سر پر جگمگاتا ہوا سہرا .... یا کسی کالی شہزادی
کے گلے میں موتیا کے گجرے .... اتنی دور تھیں
جیسے آسمان پر پھیلے ہوئے ستارے ....

.... مگر وہ جانتے تھے کہ ایک دن ان ہی تاروں کو توڑ کر زمین پر لانا ہوگا..... اندھیری چالوں میں روشنی کرنے کے لئے.......

(۲)

شیشے کی دیوار

ریسٹوران کے اندر آرٹ تھا۔ نفاست اور سجاوٹ تھی۔ اجنتا کی تصویریں تھیں۔ مہاتما بدھ کی سنگ مرمر کی مورتیاں تھیں۔ دکھن کے مندروں میں سے چرائے ہوئے نٹراج کے کانسی کے بت تھے۔ اگر دانوں سے خوشبودار دھواں نکل رہا تھا چمکتی ہوئی تھالیوں میں پوریاں، چاول اور چھ قسم کی ترکاریاں، دال، رائتہ، پکوڑیاں، مٹھائی۔ مہمان کھانا کھا رہے تھے اور ساتھ ساتھ بھارت ناٹیم کا ناچ بھی دیکھ رہے تھے۔ نوالے چبانے، ڈکارنے، چھری کانٹوں، پلیٹوں اور تھالیوں کے ٹکرانے کی آوازیں گھنگروؤں کی جھنکار کے ساتھ مل کر ایک عجیب کیفیت، ایک انوکھا آہنگ پیدا کر رہی تھیں۔

ریسٹوراں کے باہر شور تھا۔ بھیڑ بھڑکا تھا۔ ہزاروں انسانوں کا ہجوم تھا۔ محنت کے پسینے کی بو تھی۔

اندر ایک دبلی پتلی پیلے چہرے والی باکمال رقاصہ پرانے محلوں اور مندروں کے ناچ ناچ رہی تھی۔ طبلے اور مردنگ کی تال پر۔

باہر لوگ گا رہے تھے، شور مچا رہے تھے، سیٹیاں بجا رہے تھے، ٹین کے کنستر پیٹ رہے تھے۔ ناچ رہے تھے۔ تالیوں اور اپنے دلوں کی جوشیلی

دھڑکن کی تال پر۔ سڑک پر۔ دکانوں کے سامنے کی پٹری پر۔ ٹراموں کی چھتوں پر۔ ایک جوشیلا، بے ہنگم، بے قاعدہ ناچ جس کا ذکر ترتیہ شاستر میں کہیں نہیں لکھا۔

"اندر" اور "باہر" کے درمیان بس ایک شیشے کی دیوار تھی جس میں سے نظر آسکتا تھا مگر آواز باہر نہ جا سکتی تھی۔ "باہر" کی بھیڑ میں سے چند نوجوان اس شیشے کی دیوار میں سے "اندر" جھانک رہے تھے۔ مگر جو ڈراما انھیں دکھائی دیا اس میں رنگینی تھی، مگر آواز نہیں تھی، زندگی نہیں تھی۔ شیشے کی دیوار میں سے ایسا لگتا تھا جیسے ساز بے آواز ہیں۔ ناچنے والی پرانے زمانے کی کوئی دیوداسی ہے جس کے گھنگرو ہمیشہ کے لئے خاموش ہو چکے ہیں۔ اور میزوں کے گرد بیٹھے ہوئے مہمان موٹے تازے بھوت ہیں جو ازل سے ابد تک کھاتے ہی رہیں گے.......

"اندر" عیش تھا۔ آرام تھا۔ بند کمرے کی گرمی تھی، گھٹن تھی۔

"باہر" سمندر کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔

"اندر" آرٹ اور کلچر اور "خوش مذاقی" تھی۔

"باہر" شور تھا، ہنگامہ تھا، ہلچل تھی۔

"اندر" اگربتیوں اور سینٹ کی خوشبو تھی۔

"باہر" ہزاروں انسانوں کے پسینے میں نہائے ہوئے جسموں کی بو تھی۔

"اندر" حسن تھا، باقاعدگی تھی اور موت!

"باہر" بدصورتی تھی۔ بے قاعدگی تھی اور زندگی!

اور "اندر" اور "باہر" کے درمیان صرف ایک شیشے کی دیوار کھڑی اپنے ٹوٹنے کا انتظار کر رہی تھی۔

(۳)

لال روشنائی

"ڈیم"

لمبے بالوں والے نوجوان نے آکسفورڈ کے سیکھے ہوئے لہجے میں کہا اور اپنے چاندی کے سگریٹ ہولڈر سے راکھ جھاڑتے ہوئے سرخ چمڑے میں مجلد کتاب کو تپائی پر رکھ دیا جسے وہ پڑھ نہیں رہا تھا بلکہ صرف تصویریں دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے قریب رکھے ہوئے گلاس کو اٹھایا۔ وسکی سوڈا کا ایک گھونٹ پیا، مخملی صوفے پر سے اٹھا اور نرم اور قیمتی ایرانی قالین پر چلتا ہوا کھڑکی تک پہنچا۔

کھڑکی میں سے اس نے ایک حقارت بھری نظر اس بے ہنگم بھیڑ پر ڈالی جو اس کے مکان کے سامنے سڑک پر جمع ہو گئی تھی۔ جہاں تک نظر جاتی تھی بھیڑ ہی نظر آتی تھی۔ ماٹنگا اور ماہم، دادر اور پریل، بھنڈی بازار اور نیلیشور، گرگام، کالبا دیوی اور نہ جانے شہر کے کس کس کونے سے یہ لوگ چل کر آئے تھے۔ پریل کے بہت سے مزدور کھلی ہوئی [illegible] بولیں [illegible] بھیجا پیچھے بھرے ہوئے تھے اور بے فکری سے گا رہے تھے [illegible] ہے" اور "پنڈت جواہر لال نہرو زندہ باد" کے نعرے [illegible] اس نے کہا۔

سڑک پر موٹروں کی قطار رکی ہوئی تھی ۔ اور اب انسانوں کا یہ دریا رک کر ایک سمندر بنتا جا رہا تھا ۔ مگر بھیڑ میں کسی کو کوئی فکر نہیں تھی ، وہ باتیں کر رہے تھے ، مذاق کر رہے تھے ، ہنس رہے تھے ۔ یوں ہی شور مچا رہے تھے پپیپیاں اور سیٹیاں اور بانسریاں اور تالیاں بجا رہے تھے ۔ ٹین کے کنستروں کو پیٹ رہے تھے ، اور چند جوشیلے عین سڑک پر تھرک تھرک کر ناچ رہے تھے ۔ نہ جانے کیوں وہ ہولی اور دیوالی ، عید اور بقر عید سے بڑھ کر اس جشن جمہوریت کو منا رہے تھے ۔

" ہنہہ ! اینگلو امریکی سامراج کے پٹھو ! ڈالمیا ۔ برلا کے ایجنٹ ! " لمبے بالوں والے نوجوان نے کھڑکی بند کرتے ہوئے کہا ۔ اور اس " عوام دشمن " بھیڑ کے شور کو اپنے انقلابی کانوں تک آنے سے روک دیا ۔ پھر وہ اپنی میز تک گیا ، گھومنے والی کرسی پر بیٹھ کر اپنا سونے کا فاؤنٹن پن نکالا جس میں لال روشنائی بھری ہوئی تھی اور لکھا :-

> " آج سارے دیش میں نئے آئین اور اس کی نام نہاد جمہوریت کے خلاف غم اور غصے کی لہر دوڑی ہوئی ہے ۔ محنت کش عوام اس ڈھونگی " جشنِ جمہوریت " میں کوئی حصہ نہیں لے رہے ہیں ... "

(۴)

اعلان

" برٹش کراؤن ملز " کے سیٹھ موٹا لال چھوٹے چند نے اپنے مل کے سارے

کلرکوں اور مزدوروں کو اکھٹا ہونے کا حکم دیا تھا۔ آج کے دن وہ ایک تاریخی اعلان کرنے والے تھے

مجمع میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ کسی کا خیال تھا کہ سیٹھ صاحب اعلان کریں گے کہ انھوں نے یونین کی مانگیں منظور کر لی ہیں۔ اور سب کی مزدوری بڑھادی گئی ہے۔ دوسرے سمجھتے تھے کہ سیٹھ مزدوری تو نہیں بڑھائے گا ہاں اس مبارک دن کی خوشی میں مہینے دو مہینے کا بونس ضرور بانٹ دے گا۔ باقی سب سوچ اور انتظار میں تھے کہ سیٹھ صاحب کیا کہتے ہیں۔

"مزدور بھائیو! اور بہنو! آج کے شبھ دن جب بھارت دیش جمہوریت کی طرف ایک تاریخی قدم بڑھا رہا ہے۔ میں آپ کو ایک بڑی خوش خبری سنانا چاہتا ہوں جس کو سن کر مجھے یقین ہے کہ آپ سب خوشی سے پھولے نہ سمائیں گے۔"

مزدوری میں اضافہ؟

بونس؟

کئی دن کی مزدوری سمیت چھٹی؟

انتظار! بے چینی!

سیٹھ صاحب نے ڈرامائی وقفے کے دوران میں اپنی سفید کھدر کی گاندھی ٹوپی کو دوبارہ سر پر جمایا، دوبارہ کھنکار کر گلا صاف کیا، سامنے رکھے ہوئے چاندی کے گلاس میں سے پانی پیا اور پھر بولے۔

"ہمارے مل کے سب ڈائرکٹروں نے فیصلہ کیا ہے کہ آج کے دن

کی خوشی میں برٹش کراؤن ملز کا نام بدل کر سوتنتر بھارت ملز کر دیا جائے گا اس سے بڑھ کر آپ سب کے لئے خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے......"

انھوں نے ایک لمحہ انتظار کیا کہ تالیاں بجیں مگر مجمع پر چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس لئے انھوں نے اپنی تقریر جاری رکھی۔

"ایک بات اور کہنی ہے جیسا آپ خود سوچ سکتے ہیں۔ مل کا نام بدلنا کوئی آسان یا سستا کام نہیں ہے۔ کتنے ہی سائن بورڈ نئے بنوانے ہوں گے۔ نئے نام کی رجسٹری کرانی ہوگی۔ کپڑے کے تھانوں پر کے ٹھپے بدلے جائیں گے۔ خط کے کاغذ، لفافے۔ نئے چھپوائے جائیں گے۔ اس لئے مجھے افسوس ہے کہ اس سال ہم آپ کو کوئی بونس نہ دے سکیں گے۔ مگر مجھے وشواس ہے کہ اس مل کے دیش بھگت مزدور ہمارے اس فیصلے کو پسند کریں گے۔ جیسا کسی مہاپرش نے کہا ہے۔ انسان روٹی ہی کھا کر نہیں جیتا، اس کے لئے راشٹریہ آدرش اور دیش سیوا کا بھوجن بھی تو چاہیے۔ ہا ہا ہا!"

یہ کہہ کر وہ اپنے ہی مذاق پر زور سے ہنسے۔ مگر ان کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ سب مزدور کیوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ جیسے ان سب کو کوئی سانپ سونگھ گیا ہو۔

(۵)

گنڈا اور مہا گنڈا

"جمہوریت زندہ باد" گنڈے نے زور سے نعرہ لگایا جب اسے بتایا گیا

کہ جشن جمہوریت کی خوشی میں اُسے اور بہت سے قیدیوں کو چھوڑ دیا گیا ہے۔

"میں چلا باہر" اُس نے خوشی سے وارڈروں کو بتایا "واہ ری ہماری سرکار خدا کرے ایسے ایسے جشن جمہوریت روز ہوا کریں"۔

مگر جب وہ جیل کے پھاٹک سے باہر نکلا تو اُس نے دیکھا کہ ایک نئے قیدی کو اندر لے جایا جا رہا ہے۔ یہ ایک دُبلا پتلا زرد رو جوان تھا جو شکل سے چور، ڈاکو، گُنڈا ہرگز نہ لگتا تھا۔

"ارے بھائی آج اندر جانے کا نہیں باہر آنے کا دن ہے" گُنڈا چلایا "تم کہاں چلے"؟

"آج تمھارے باہر آنے کا اور میرے اندر جانے کا دن ہے" نوجوان نے پیلی سی مُسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا "تم نے صرف چوری کی تھی مگر میرا جُرم بہت سنگین ہے"۔ گُنڈے نے سوچا میں تو صرف گُنڈا ہوں یہ ضرور کوئی مہا گُنڈا ہوگا۔ پھر اس نے نوجوان سے پوچھا "کیا ہے تمھارا جرم؟"

نوجوان نے کہا "میں شاعر ہوں"۔

(۶)

مذاق

پریس میں رات کو بھی کام ہو رہا تھا کہ کل سویرے اخبار کا جشن جمہوریت نمبر نکلنے والا تھا۔ پینسٹھ سالہ دمے کا مریض کاتب ..... جو ملازمت کے چالیس سال میں تقریباً اندھا ہو گیا تھا اور جو اسّی روپے ماہوار پر اپنا اور اپنے بیوی بچّوں کا

پیٹ پالتا تھا، ایک خشک سی ہنسی ہنسا۔ جب کتابت کرتے ہوئے اس نے اپنی ٹوٹی ہوئی کمانی کی عینک میں سے ایڈیٹوریل کا آخری پیراگراف پڑھا:۔

"آج ہم قسم کھاتے ہیں کہ آزاد جمہوری ہندوستان میں نہ کوئی بے کار رہے گا اور نہ بھوکا۔ مزدوروں کو ان کی مزدوری کا پورا پورا حق ملے گا اور بوڑھا ہونے پر انھیں پنشن دے کر آرام کرنے کا موقع دیا جائے گا......"

(۷)

بتّیاں بُجھادو

بھکاری کو غصّہ آرہا تھا۔

سارا دن کتنا بُرا کٹا تھا۔ سڑکوں پر اتنی بھیڑ تھی کہ ایک شریف بھکاری کو بھیک مانگنے کے لئے ہاتھ پھیلانے کی جگہ بھی نہیں تھی۔ اور نہ اس خوفناک شور میں کوئی اس کی "بھگوان کے نام پر بابا" کی پکار سُن سکتا تھا۔ آدھی رات تک ہزاروں آدمیوں کا غول بیابانی اس سڑک کی پٹری پر سے گزرتا رہا تھا جو برسوں سے اس کی "خواب گاہ" تھی۔ اس کے قیمتی چیتھڑے جو بیک وقت اس کی رضائی، توشک، تکیے اور چادر کا کام دیتے تھے ہزاروں قدموں میں روندے جاکر اب کھوئے جا چکے تھے۔

گھنٹہ گھر دو بجا رہا تھا۔ جب بھیڑ کم ہوئی اور وہ اپنی پٹڑی کے پتھریلے گدّے پر لیٹ سکا تو اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ مگر اب بھی اس کے لئے

سونا ممکن نہیں تھا۔

چاروں طرف، اوپر نیچے، دائیں بائیں، آس پاس کی سب عمارتوں پر لاکھوں بتّیاں بے کار جل رہی تھیں۔ اس ساری جگمگاہٹ کا بس ایک ہی مقصد معلوم ہوتا تھا کہ بھکاری ان کی خوفناک روشنی میں نہ سو سکے۔

غصّے سے کانپتا، آنکھیں ملتا وہ اُٹھا اور چوراہے کے بیچوں بیچ آکر کھڑا ہو گیا ـــ اس نے نظر اُٹھا کر اُن روشنیوں کو دیکھا جو اُسے سونے نہ دے رہی تھیں، جو اس پر ہنس رہی تھیں، اس کا مذاق اُڑا رہی تھیں۔ یہ روشنیاں اس کی دُشمن تھیں اور اسے اُن سے نفرت تھی۔ دیر تک وہ غصّے بھری نظروں سے انھیں گھورتا رہا۔

پھر اس نے بے پناہ نفرت سے زمین پر تھوکا۔ ایک گالی اس کی زبان سے نکلی۔ اور سنسان چوراہے کے گرد گونج گئی۔ اور سر اُٹھا کر آسمان کے تاروں کو مخاطب کرتے ہوئے وہ چلّایا۔

"بجھا دے بھگوان۔ اِن بتّیوں کو بجھا دے۔"

بچّوں کا خط مہاتما گاندھی کے نام

بمقام جنت یا سورگ پہنچ کر اللہ میاں یا بھگوان کی معرفت جناب مہاتما گاندھی کو ملے۔

پیارے باپو۔ ہمارے باپو۔

کتنے ہی برس کے بعد ہم دونوں انور اور گوپال مل کر آپ کو یہ دوسرا خط لکھ رہے ہیں۔ ایک خاص وجہ سے۔

ہم نے آپ کے جنت سدھارنے کے تھوڑے دن بعد ہی آپ کو خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ آپ کو ضرور ملا ہوگا۔ وہ خط انور نے اپنے چھوٹے بھائی بندو اور چھوٹی بہن زینب اور گوپال اور گوپال کی بہن سیتا اور موہن کی طرف سے لکھا تھا۔ (موہن تو آپ کو یاد ہوگا ہی، وہی شرنارتھی لڑکا جو کئی مہینے تک منہ سے کچھ نہ بولتا تھا۔ اور جس کی آنکھیں کہتی تھیں باپو کو خط لکھو۔ باپو اب وہ بولنے لگا ہے اور آپ کو بہت یاد کرتا ہے۔ اور کہتا ہے اگر آپ

ہمارے پاس ہوتے تو اُس جیسے لاکھوں شرنارتھیوں کو اتنے دکھ نہ سہنے پڑتے۔ اور ہاں باپو ہم ایک رفیوجی کیمپ دیکھنے گئے تھے۔ وہاں لوگ بڑی تکلیف میں تھے مگر اُس کا حال آگے چل ہم لکھیں گے،

جب ہم نے وہ پہلا خط لکھا تھا۔ ہم دونوں آٹھ آٹھ برس کے تھے آپ کو ہمارا پہلا خط ضرور یاد ہوگا۔ اور اُس خط میں ہم سے لکھائی کی بہت سی غلطیاں کی تھیں۔ مگر اب تو ہم بڑے ہو گئے ہیں۔ اور ہائی اسکول میں پڑھتے ہیں۔ انور نے ہندی بھی سیکھ لی ہے۔ اور گوپال نے اردو۔ اب ہم دونوں اردو اور ہندی میں لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ جیسا آپ چاہتے تھے کہ سب ہندوستان کے لوگوں کو کرنا چاہیے۔

اس لیے آپ کو یہ خط ہم دونوں اردو ہندی میں لکھ کر بھیج رہے ہیں۔ انور ہندی میں لکھ رہا ہے۔ اور گوپال اردو میں۔ کیوں کہ ہم دونوں نے یہ لپی نئی نئی سیکھی ہے۔ اس لیے غلطی ہو تو معاف کریں۔

ہاں تو اپنے پہلے خط میں ہم نے آپ کو لکھا تھا کہ جب آپ کا انتقال ہو گیا تو ہندو مسلمان پاکستان ہندوستان میں سب بہت روئے۔ اور سب نے توبہ کر لی اور کان پکڑے کہ اب وہ مار دھاڑ نہیں کریں گے۔ اور ہم نے (یعنی انور اور گوپال اور بندا اور زینب اور سکینہ اور سیتا) نے اپنے تیر کمان اور ہوائی بندوق اور پستول (جن کو لے کر ہم ہندو سینا اور اسلامی فوج کا کھیل کھیلا کرتے تھے)، سب توڑ کر پانی میں پھینک دیئے تھے۔ اور کان پکڑ کر توبہ کی تھی کہ اب کبھی آپس میں نہ لڑیں گے۔ اور آپ کو لکھا تھا۔ کہ

اب ہمیں معاف کر دیجیے، اور لوٹ آیئے۔

مگر آپ لوٹ کر نہیں آئے۔ باپو۔

بہت دنوں تک ہم انتظار کرتے رہے۔ اور روزانہ ایک دوسرے سے کہتے کہ باپو لوٹ کر ضرور آئیں گے۔ کیوں کہ سب کہتے ہیں کہ باپو نے کبھی بچّوں کی بات نہیں ٹالی۔ پر جب آپ نہیں آئے تو ہم نے سوچا کہ شاید ہم نے ہی کوئی ایسی بات کی ہوگی۔ جس سے باپو ہم سے اب تک روٹھے ہوئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ پاکستان ہندوستان دونوں مُلکوں میں اب بھی ایسے بہت سے لوگ ہیں جن کے دلوں میں غصّہ اور نفرت بھری ہوئی ہے۔ اور کتنے ہی مسلمان ہندو اب بھی ایک دوسرے کو مارنا چاہتے ہیں۔

اور پھر ہمارے پڑوس میں بنگالی شرنارتھی آکر ٹھیرے جو بیچارے مشرقی پاکستان سے بھاگ کر آئے تھے۔ کیوں کہ وہاں کے بُرے مسلمان ہندوؤں کو مار رہے تھے۔ باپو یہ بنگالی ایک الگ ہی زبان بولتے ہیں۔ جو سمجھ میں تو نہیں آتی مگر بڑی میٹھی لگتی ہے۔ اور جب وہ ہندوستانی بھی بولتے ہیں تو عجیب ڈھنگ سے۔ جیسے مُنہ میں رس گلّا لے کر بول رہے ہوں۔ اس بنگالی خاندان کے سب سے بڑے بوڑھے جو ہیں انھیں سب شمبھو دادا کہتے ہیں۔ ان کی عمر شاید سو برس کی ہے۔ مگر اسّی برس کی تو ضرور ہوگی۔ بڑے اچھے آدمی ہیں۔ اور اتنے بڈھے ہونے پر بھی بچّوں کو بہت پیار کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ آپ کے جنّت سدھارنے کے بعد ایک ڈیڑھ برس بعد تک تو مشرقی پاکستان میں بھی امن امان رہا

پھر دھیرے دھیرے بڑے بڑے آدمیوں نے ہندوؤں کو کم گنتی میں سمجھ کر اُن کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ بہت سوں کو مارا بھی اور لاکھوں ہندو ریلوں اور جہازوں میں اور پیدل ہندوستان کی طرف چل پڑے۔ اور سُنا ہے کہ کلکتے جیسے بڑے شہر میں بھی اتنے لوگوں کو سمانے کی جگہ نہ ملی۔

ہزاروں تو ریل کے اسٹیشن پر ہی پڑے رہے۔ اور شاید اب بھی پڑے ہیں۔ شمبھو دادا کہتے ہیں کہ ہمارے ہندوستان کی طرف سے بنگال میں بھی اچھا نہیں ہوا۔ اور بڑے ہندوؤں نے مسلمانوں کو تنگ کیا۔ اور کتنوں کو مارا بھی۔

اور جیسا پہلے پنجاب میں ہوا تھا۔ اسی طرح بنگال میں بھی ہوا۔ لاکھوں مسلمان پاکستان جانے لگے۔ اور لاکھوں ہندو اُدھر سے اِدھر آنے لگے۔

تو پھر ہم نے سوچا کہ باپو نے اپنی جان بھی دے دی اور ہم ہندوستان پاکستان والوں نے کچھ سیکھا ہی نہیں۔ جب ہی تو باپو اب تک ہم سے روٹھے ہوئے ہیں۔ اور لوٹ کر نہیں آتے۔

در اصل ہم اسی لئے آپ کو خط لکھ رہے ہیں کہ اب بھی لوٹ کر نہ آئیے گا۔ نہیں تو آپ کی جان پھر خطرے میں ہے۔ آپ کے دشمن گنتی میں بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ اور اب تو کھُلے دھڑلے اونچی اونچی باتیں آپ کے خلاف کرتے ہیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو آپ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کو کہتے ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان کے باشندے آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

اور ہندوستان اور پاکستان صلح صفائی سے رہیں تو ان کو بھی بہت سے لوگ بُرا کہتے ہیں اور گالیاں بھی دیتے ہیں۔ اور ہیں تو اُن کی جان بھی خطرے میں رہتی ہے۔

اس لئے ہم آپ کو یہ خط لکھ رہے ہیں۔ کہ ابھی آپ لوٹ کر نہ آیئے گا۔ مگر ہم آپ کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر آپ کی حفاظت کا انتظام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور جب ہماری طاقت ایسی زوردار ہو جائے گی تو ہم آپ کو لکھ دیں گے اور آپ ضرور لوٹ آیئے گا۔ پھر کوئی ڈر کی بات نہیں۔

ابھی تو ہم آپ کے دشمنوں کی فہرست تیار کر رہے ہیں۔ (اور نام لکھ رہے ہیں) ایسے تین چار آدمی تو ہمارے پڑوس ہی میں رہتے ہیں۔

ایک تو سیٹھ شیر علی پیر علی ہے جو سڑک کے نکڑ والی بلڈنگ میں رہتا ہے۔ وہ بلڈنگ تو اس نے سندھ سے آئے ہوئے ایک سیٹھ کے ہاتھ بیچ دی ہے۔ سُنا ہے ڈیڑھ لاکھ میں۔ شیر علی پیر علی کے ایسے ہی اور بھی کئی مکان شہر میں تھے۔ ایک ایک کرکے یہ سارے اس نے بیچ دیئے ہیں اور اب وہ چپکے چپکے اس روپے کو پاکستان بھیج رہا ہے۔ اور جلد ہی خود بھی سارے خاندان سمیت پاکستان جانے والا ہے۔ یہ شیر علی پیر علی پہلے مسلم لیگ میں ہوا کرتا تھا۔ اور سُنا ہے۔ دنگا فساد کرنے والے مسلمانوں کو پیسہ بھی دیتا تھا! اور آپ کو گالیاں دیتا تھا

مگر پاکستان بننے کے بعد جھوٹ موٹ کا کانگرسی بن گیا۔ اور وہ کھادے

کے لیے آپ کا نام بھی عزت سے لینے لگا۔ اور جب ہمارے محلّے کی امن کمیٹی بنی تو اس کا ممبر بن گیا۔ مگر در اصل اس کے دل میں شروع سے کھوٹ تھا اور وہ اپنی جائداد بیچنے کے انتظار میں تھا کہ سارا روپیہ بھیج کر خود بھی پاکستان بھاگ جائے۔

ممکن ہے کہ آپ کہیں کہ تم کیوں کسی شریف آدمی پر شک کرتے ہو۔ باپو آپ تو جیسے خود اچھے اور نیک دل آدمی تھے ویسا ہی اوروں کو سمجھتے تھے۔ مگر آپ نہیں جانتے کہ آپ کے دشمن آپ کے ساتھیوں کے خلاف کیسی کیسی چالیں چلتے ہیں۔

یہ شیر علی پیر علی بڑا خطرناک آدمی ہے۔ اس کا لڑکا محمود ہماری ہی کلاس میں پڑھتا تھا۔ جب اس نے نام کٹایا تو انور نے پوچھا کیوں محمود اسکول کیوں چھوڑ دیا۔ تب اس نے چپکے سے انور کو بتایا کہ اس کا باپ اور سب گھر والے تو پاکستان جا رہے ہیں۔ انور نے کہا اور تمھاری جائداد کا کیا ہوگا۔ تو محمود بولا۔ میرے بابا نے سب انتظام کر لیا ہے۔ آدھے سے زیادہ روپیہ تو پاکستان پہنچ بھی گیا۔ پھر وہ انور سے کہنے لگا۔ تمھارے ابا جی پاکستان کیوں نہیں جاتے۔ ان کافروں کے ملک میں کیوں رہتے ہو۔ انور نے کہا خبردار جو ایسی بات کہی ہوگی۔ محمود نے کہا جاؤ جاؤ ہم کسی سے نہیں ڈرتے۔ جانتے ہو ایک مسلمان دس کافروں پر بھاری ہوتا ہے جب ہماری پاکستانی فوجیں ہندوستان کو ختم کریں گی تب پتہ چلے گا۔

اس پر انور اُسے مارنے لگا تھا۔ کہ وہاں گوپال آ گیا اور اس نے کہا نہیں انور

باپو نے مار دھاڑ کو منع کیا تھا......... مگر اُس دن سے محمود جب بھی انور کو دیکھتا ہے اس کو کافر کافر کہہ کر چڑاتا ہے۔ اور ہمارا ارادہ ہوتا ہے کہ اُسے ٹھیک بنا دیں مگر آپ سے ڈرتے ہیں۔

اصل بات انور کو چڑانے کی نہیں ہے۔ مگر اس شیر علی پیر علی اور اس کے بیٹے جیسوں نے یہاں کے سارے مسلمانوں کو بدنام کر دیا ہے۔ بہت سے ہندو کہنے لگے ہیں۔ مسلمانوں کا کیا اعتبار۔ شیر علی پیر علی کی طرح یہ سب چھپے ہوئے پاکستانی ہیں۔ اور اس طرح دلوں میں کھوٹ پڑتا جا رہا ہے۔ اور نہ جانے کب پھر خون خرابا شروع ہو جائے۔

چند روز ہی کی بات ہے کہ ہماری کلاس کا ایک لڑکا بھیشم راؤ گوپال کو الگ لے جا کر کہنے لگا۔ تم ہندو ہو کر اس مسلمان لڑکے انور سے کیوں ملتے جلتے ہو۔ گوپال نے کہا وہ تو میرا دوست ہے۔ بھیشم نے کہا بھلا کبھی مسلمان بھی ہندو کا دوست ہو سکتا ہے۔ یہ تو ہمارے دشمن ہیں دشمن۔ گوپال نے کہا دیکھو میرے دوست کو کچھ کہو گے تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں۔

بھیشم نے کہا کل اتوار کی چھٹی ہے۔ سویرے ہمارے گھر لڑکوں کا جلسہ ہے اُس میں ضرور آنا۔ گوپال نے کہا اچھا میں انور سے کہوں گا کہ سویرے کرکٹ کھیلنے کے بجائے بھیشم کے یہاں جلسے میں چلیں گے۔ اس پر بھیشم راؤ بولا۔ نہیں۔ انور کو مت لانا۔ گوپال نے کہا میں اور انور تو ہر جگہ ایک ساتھ جاتے ہیں۔

بھیشم نے کہا خیر۔ تم کل جلسے میں تو آنا۔ پھر دیکھا جائے گا۔ مگر انور کو

ساتھ مت لانا۔ وہاں پوجا بھی ہوگی۔ اس لئے مسلمان کا آنا ٹھیک نہیں۔

گوپال نے انور کو یہ بات بتائی اور کہا میں تو نہیں جاؤں گا ایسے جلسے میں۔ انور نے کہا جا کر دیکھو تو کیا ہوتا ہے۔ جن لوگوں نے باپو کو قتل کیا تھا وہ بھی تو ایسے ہی جلسے کیا کرتے تھے۔ کون جانتا ہے باپو کے خلاف کوئی نئی سازش کر رہے ہیں۔

سو اگلے دن صبح کو گوپال بھیشم راؤ کے ہاں پہنچ گیا۔ وہاں دیکھا تو بہت سے لڑکے جمع ہیں اور آنگن میں ورزش کر رہے ہیں۔ ورزش کے بعد لاٹھی چلانا اور تیر چلانا سکھایا گیا۔ گوپال نے بھیشم سے کہا تیر کمان اور پستول تو ہمارے پاس بھی تھے۔ مگر جس دن باپو کا انتقال ہوا ہم نے وہ سب سمندر میں پھینک دیئے۔ اس پر بھیشم بولا۔ یہ کیا غضب کیا۔ مل جائیں تو نکال لو۔ تیروں کو تیز کر لو۔ اور پستول میں گولیاں بھر لو۔ بڑے گھمسان کی لڑائی ہونے والی ہے۔

گوپال نے کہا کیوں کس سے لڑائی کی تیاری ہے۔ اس نے جواب دیا۔ دشمن تو سب کو ہی معلوم ہے۔ پہلے تو جو مسلمان یہاں ہیں۔ انھیں سبق سکھانا ہے۔ اور پھر پاکستان کو فتح کرنا ہے۔

گوپال کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اتنے میں پوجا شروع ہو گئی۔ مگر بجائے دیوی لکشمی کے یا دیوی سرسوتی یا کرشن مہاراج کے کالی ماتا کی پوجا کی گئی۔ پھر بھیشم کے پتاجی نے ایک تقریر کی۔ جس میں کہا کہ ہندو بچوں کو بھی اپنے دھرم اور دیش کے لئے لڑنے مرنے کو تیار ہو جانا چاہیئے۔ ہمیں پاکستان کو

ملیا میٹ کر کے اس علاقے کو ایک بار پھر بھارت بھومی میں لانا ہے۔ اور جو مسلمان ہندوستان میں ہیں ان کو بھی غداری کی سزا دینی ہے۔ اس پر گوپال سے نہ رہا گیا۔ اس نے کہا باپو نے ہم کو لڑنے مرنے سے منع کیا تھا۔ ہمیں ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا چاہیے۔ آپ کا نام سُن کر بھیشم کے پتا ہی نہیں جتنے لڑکے بھی موجود تھے سب ہنس پڑے۔ اور بھیشم کے پتا بولے: بھیا تم کس کا نام لیتے ہو۔ یہ گاندھی ہی کا کیا دھرا تو ہے۔ کہ آج مسلمانوں کے حوصلے اتنے بڑھے ہوئے ہیں۔ اور آپ کو بہت کچھ بُرا بھلا کہا جو گوپال نے سُنا اگر وہ رو پڑا۔ اور اس پر جب سب ہنس پڑے اور اس کا مذاق اُڑانے لگے تو وہ ہاں سے اُٹھ کر چلا آیا۔

ایک بُرا آدمی اور ہمارے محلّے میں رہتا ہے۔ اُس کا نام ہے سیٹھ کروڑی مل۔ اس کا بیٹا سونا مل بھی ہمارے ہی اسکول میں پڑھتا ہے۔ بڑا کوڑھ مغز اور بد تمیز ہے۔ ہے تم سے بڑا اگر ابھی تیسری کلاس میں ہی پڑھتا ہے۔ تین برس سے اسی کلاس میں ہے۔ کبھی فیل ہو جاتا ہے کبھی امتحان نہیں دیتا۔ ہر روز ایک لمبی چوڑی کالی کار میں بیٹھ کر اسکول میں آتا ہے۔ ریشمی قمیص اور نیکر پہنتا ہے۔ اور اس کے ہاتھ پر ایک خوبصورت سونے کی گھڑی لگی رہتی ہے۔ اس کا باپ اُسے پانچ روپے روز جیب خرچ کے دیتا ہے۔

اسی لئے بڑی کلاسوں کے لڑکے اس کی خوشامد میں لگے رہتے ہیں۔ صرف ہم دونوں ہی ہیں جو اُسے مُنہ نہیں لگاتے۔ سونا مل کو اپنی امیری کی شان

جانے کا بڑا شوق ہے۔ اسی لئے اس نے اپنی سال گرہ کے دن سارے اسکول کے لڑکوں کی دعوت کر ڈالی۔ ہمارا ارادہ تو اس کے ہاں جانے کا نہیں تھا مگر انور کے ابا نے اس سے کہا تم ضرور جانا نہیں تو لوگ شاید یہ سمجھیں گے کہ تم مسلمان ہونے کی وجہ سے وہاں نہیں گئے۔ پھر ہم نے بھی سوچا چل کر دیکھیں تو سہی وہاں کیا ہوتا ہے۔ کوئی ہوّا تھوڑا ہی ہے کہ کھا جائے گا۔ سو ہم دونوں بھی دعوت میں پہنچ گئے۔

باپو آپ تو جانتے ہی ہیں کہ آج کل راشن کارڈ بنا چٹکی بھر آٹا بھی نہیں ملتا۔ انور کے گھر میں سب ملا کر پورے نو راشن کارڈ ہیں۔ تب بھی بس ہفتے بھر کے لئے سیر چاول آتے ہیں۔ اور سیر آٹا۔ اور بس۔ دو مہمان بھی آجائیں تو ابا کھانے کی میز پر کہہ دیتے ہیں "گھر والے سب ہوشیار۔ ہوشیار" اس سے انور اور اس کے بھائی بہن سب سمجھ جاتے ہیں۔ کہ کم کھانا چاہیے۔ تاکہ مہمان بھوکے نہ رہ جائیں۔ اور گوپال کے پتا جی تو روز ہی سب بچوں کو کہتے رہتے ہیں "کچی ترکاریاں زیادہ کھاؤ۔ چاول پوری کم کھاؤ۔ راشن کا زمانہ ہے" مگر اس دن جب ہم سونالی کے ہاں گئے تو ایسا لگتا تھا جیسے راشن واشن ختم ہو گیا ہو۔ باپو آپ تو بہت ہی کم کھاتے تھے۔ بس دو چار کھجوریں اور بکری کا آدھ سیر دودھ۔ اتنا دودھ تو انور کی ننھی چھوٹی بہن مینا ہی پی جاتی ہے۔ وہاں مینا کا تعارف تو آپ سے نہیں کرایا۔ آپ کو جب ہم نے پہلا خط لکھا تھا۔ اس کے بہت ہی دنوں بعد وہ آئی تھی۔ وہ ابھی ڈیڑھ برس کی ہے اور آپ کی طرح منہ میں دانت نہیں ہیں۔

وہ ابھی بولتی بھی نہیں۔ ماما بابا ہی بس کرتی ہے۔ مگر وہ بولتی تو ضرور آپ کو سلام لکھواتی۔ کیوں کہ وہ آپ سے بہت ہی محبت کرتی ہے۔ اور آپ کی تصویر کے سامنے کھڑی باپو باپو کرتی ہے۔ اور کبھی کبھی کہتی۔ باپو باپو آجا آجا۔ ہم بات تو کرتے تھے سونامل کی دعوت کی اور پہنچ گئے، کہیں سے کہیں۔ ہاں تو وہاں کھانا جو دیکھا تو ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بڑے بڑے کڑھاؤں میں سینکڑوں ہزاروں پوریاں تلی جا رہی تھیں۔ دس قسم کی ترکاریاں و مٹر پلاؤ۔ میٹھے چاول و فیرنی و دہی بڑے و پکوڑے و پکوڑیاں و رس گلے و گلاب جامنیں و جلیبیاں و رس گلے اور نہ جانے کیا کیا الابلا۔

اگر آپ دیکھتے تو آپ کو بھی بہت بُرا لگتا اور غصہ آتا۔ کیوں کہ اُسی دن اخبار میں چھپا تھا کہ بہار کے کال میں نہ جانے کتنے غریب مر گئے۔

گوپال نے سونامل سے پوچھا کیوں بھئی راشن کے زمانے میں تمہارے ہاں اتنے چاول اور اتنا آٹا کہاں سے آگیا۔ تو وہ ہنس کر بولا۔ ارے یہ کیا ہے۔ ہم چاہیں تو ہزاروں آدمیوں کو بھوجن کھلا سکتے ہیں ایک دم۔ گوپال نے پوچھا۔ بھلا اتنا بہت راشن کہاں سے آتا ہے۔ اس پر سونامل نے چپکے سے کہا۔ کسی سے نہ کہنا۔ مگر میرے پتا جی کے گوداموں میں ہزاروں من اناج بھرا پڑا ہے۔ اُڑتی اُڑتی خبر ہم نے پہلے ہی سُن لی تھی کہ کڑوڑی مل بلیک مارکیٹ کرتا ہے۔ مگر اُس دن تو اُس کے بیٹے نے اس کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ یہ سُن کر ہم دونوں کا تو کچھ کھانے کو جی نہ چاہا۔ مگر اوروں کا ساتھ دینے کے لئے بیٹھ گئے۔ اتنے میں سیٹھ کڑوڑی مل خود بھی آگیا۔ باپو۔ وہ اتنا موٹا ہے اتنا موٹا ہے

کہ آپ بُرا نہ مانیں تو کہہ دیں۔ آپ جیسے تو اس میں سے دس بارہ بن سکتے ہیں اپنی بڑی تو ند جیسے مٹکا۔ ایسا لگتا ہے جیسے بلیک مارکیٹ کا سارا اناج اس کے پیٹ میں ہے۔ ہنستا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے بھونچال آ گیا ہو۔ وہ جب آیا تو ہم نے دیکھا کہ کھدر کے کپڑے اور گاندھی کیپ پہنے ہے۔ ہم نے سوچا ان کالے بازاریوں کی ہمت تو دیکھو۔ باپو کے کھدر اور ٹوپی کو بدنام کرتے ہیں۔ کمرے میں تجوری کے اوپر ہی اس نے آپ کی بڑی ساری رنگین تصویر بھی لگا رکھی ہے۔ کمرے میں آتے ہی اس کی طرف پرنام کر کے بیٹھ گیا اور لگا پوریوں اور رس گلّے اور جلیبیوں کا صفایا کرنے۔ وہ دن اور آج کا دن۔ ہم نے تو سونا مل سے بات کرنا ہی چھوڑ دی ہے۔

مگر وہ رفیوجی کیمپ کی بات لکھنا تو بھول گیا۔ ہوا یہ کہ موہن کے ایک رشتے کے ماما وہاں رہتے ہیں۔ سو پچھلے اتوار کو اس نے ہم دونوں سے کہا میں اپنے ماما سے ملنے جا رہا ہوں۔ تم دونوں رفیوجی کیمپ دیکھنے چلتے ہو۔ ہم نے کبھی رفیوجی کیمپ نہیں دیکھا تھا۔ ہم نے کہا چلو۔ شہر سے تین چار میل ہوگی وہ جگہ۔ پہلے تو ہم بس میں گئے۔ پھر پیدل۔ پکی سڑک سے کچی سڑک بارش کی وجہ سے خوب کیچڑ اور دلدل ہو رہا تھا۔ گھٹنوں گھٹنوں تک ہماری ٹانگیں کیچڑ میں بھر گئیں۔ ادھر سے ایک ٹرک آ رہا تھا! اس کے پہیوں نے جو گندے پانی کے چھینٹے اڑائے تو ہماری تو بے وقت کی ہولی ہو گئی۔ کیمپ جا کر دیکھا تو آٹھ دس ٹوٹی پھوٹی پُرانی ملٹری کی بارکیں ہیں ان میں تختے لگا کر کوٹھریاں بنائی ہوئی ہیں۔ اور ایک ایک چھوٹی سی کوٹھری میں

سب گھر والے۔ ہم تو دیکھ کر حیران رہ گئے، کہ ایک اتنی سی کوٹھڑی میں اتنے آدمی کیسے رہ سکتے ہیں۔ پر باپو یہ کوٹھڑیوں والے تو پھر بھی اوروں سے اچھی حالت میں ہیں۔ کتنے ہی شرنارتھی تو بال بچوں سمیت تنبوؤں اور جھونپڑیوں میں رہ رہے ہیں۔ لکڑی اور ٹین جوڑ جوڑ کر تنبو بنا لئے ہیں۔ اندر زمین بارش سے گیلی۔ اور وہیں بے چارے شرنارتھی پڑے ہوئے تھے۔ یہ سب دیکھ کر ہمیں بڑا دُکھ ہوا پر موہن کے ماما نے جو بتایا وہ سن کر تو ہمیں بڑا ہی غصہ آیا۔ بارکوں سمیت یہ ساری زمین ایک ٹھیکیدار نے لے رکھی ہے۔ اور نام کے واسطے ایک چھوٹے موٹے کی کمیٹی بھی بنائی ہے۔ اور اس کمیٹی کے نام سے وہ ہر شرنارتھی سے کرایہ چار روپے مہینے لیتا ہے۔ کوٹھڑی کا کرایہ آٹھ روپے مہینے اور جھونپڑی یا تنبو کی صرف زمین کا کرایہ چار روپے مہینے۔ اور اگر کوئی بے چارا کرایہ نہ دے سکے تو اُسے پولیس بلوا کر نکال دیتے ہیں۔

اس کیمپ میں بہت سے سردار جی رہتے ہیں۔ جو پنجاب اور فرنٹیر کے علاقے سے آئے تھے۔ اب سب جا رہے بے کار ہیں۔ تب ہی موہن کے پتا جی نے انہیں کچھ روپے بھیجے تھے۔ اور وہ ٹھیکیدار جو ان سب سے کرایہ لیتا ہے اور ان پر حکومت چلاتا ہے وہ بھی سکھ سردار ہی ہے۔ سردار سوکھ سنگھ یہ جان کر ہمیں بڑا دُکھ ہوا جب موہن کے ماما جو پاکستان سے آئے ہیں اور ریفوجی کیمپ میں رہتے ہیں) اپنا پھٹا پرانا تنبو دکھا کر کہنے لگے "اس سے تو ہم پاکستان میں ہی مر گئے ہوتے تو"

اور یہ سن کر ہمیں بھی رونا آگیا اور وہاں سے آئے تو راستے بھر دل ہی دل میں یہ سوچتے رہے کہ یہ بڑے لوگ کیوں اوروں کو دکھ دیتے ہیں۔ یہ

شیر علی پیر علی۔ یہ بھیشم راؤ کے پتا جی و سیٹھ کروڑی مل۔ اور یہ ٹھیکیدار۔ اور ان سب کو ٹھیک بنائیں تو کیسے۔

پھر موہن بولا" آؤ ایک فوج بنائیں شرنارتھیوں کی۔۔۔۔۔"

اور گوپال بولا" اور مزدوروں کی۔۔۔۔۔۔"

اور انور بولا" اور کسانوں کی۔۔۔۔۔۔۔"

اور پھر ہم تینوں بول پڑے" بچوں کی فوج۔ جوان سب بُرے لوگوں کو ٹھیک بنا دے"

مگر فوج کے پاس ہتھیار بھی تو ہونے چاہئیں۔ شیر علی پیر علی کے پاس لاکھوں روپیہ ہے۔ اور بھیشم راؤ کے ساتھی تیر کمان اور لاٹھیوں سے ڈرل کرتے ہیں۔ اور کروڑی مل کے پاس بلیک مارکیٹ کا اناج ہے۔ اور وہ رفیوجی کیمپ کا ٹھیکیدار اس کے پاس بھی نہ جانے کتنا روپیہ ہوگا۔ اور پھر موقع پڑنے پر پولیس بھی تو ان کی ہی طرفداری کرتی ہے۔ کروڑی مل کے مل میں ہڑتال ہوئی تو مزدوروں پر گولی چلانے کو پولیس جھٹ سے آگئی۔

ہماری فوج کے پاس ہتھیار آئیں تو کہاں سے آئیں۔ ہمارے پاس تو بس تیر کمان تھے۔ اور ایک ہوائی بندوق اور ایک لکڑی کا پستول۔ وہ بھی ہم نے سمندر میں پھینک دیئے تھے اور کان پکڑے تھے کہ اب کبھی ان کو لے کر آپس میں نہ لڑیں گے۔

یہی سوچتے ہوئے اس شام کو جب ہم سمندر کے کنارے ٹہلنے گئے، تو سمندر اُترا ہوا تھا۔ بہت دور تک ہم ریت پر چلے گئے، آگے جا کر کیا دیکھتے

ہیں کہ ریت کے ایک ٹیلے میں سے ایک نوکیلی چیز باہر نکلی ہوئی ہے۔

ریت کو ہٹا کر دیکھا تو وہ انور کی ہوائی بندوق تھی۔ اور گوپال کا پستول اور ٹوٹے ہوئے تیر کمان۔ پہلے ہم نے سوچا ان کو نکال کر ٹھیک ٹھاک کر لیں۔ اور تیروں کو نوکیلا کر لیں۔ ہوائی بندوق میں تیل ڈال کر اس کی کمانی پر سے زنگ اُتار لیں۔ اور پستول کو صاف کر کے اس میں پٹاخے بھر لیں۔ مگر پھر ہم نے سوچا کہ ہم نے باپو کو وچن دیا ہے کہ ان ہتھیاروں کو ہاتھ نہ لگائیں گے۔ اس لیے ہم انھیں وہیں ریت میں دبا آئے ہیں۔

مگر وہ جگہ ہمیں یاد ہے اور اب بھی جب سمندر کا پانی اُترے گا ہم انھیں نکال کر لا سکتے ہیں۔ اسی لیے یہ چٹھی آپ کو لکھ رہے ہیں کہ آپ کی اجازت ہو تو اپنے تیر کمان اور ہوائی بندوق اور لکڑی کا پستول لا کر آپ کے دشمنوں کو سیدھا کر دیں۔

تو ہے آپ کی اجازت باپو؟

جواب ضرور دیں اور جلد۔ کیوں کہ دشمن زور پکڑ رہے ہیں اور ہمیں بھی جلد سے جلد جوابی حملہ کرنا ہی چاہیے۔

آپ کے بیٹے

گوپال۔ انور

باپو ایک اور بات۔ انور کی نانی آماں بھی جنت کو سدھار گئی ہیں ایشور میاں کے ہاں تو وہ پردہ نہیں کرتی ہوں گی۔ وہ آپ کو ملیں تو ان سے کہیے گا ان کا انو انھیں بہت یاد کرتا ہے۔

انور

"پُچّی! پُچّی!!"

"پُچّی۔ پُچّی۔ کیا کر رہی ہو؟ چائے نہیں بنائی؟"

"............"

"سنو ایک بات کہنی ہے۔"

"............"

"کیوں مون برت رکھا ہے کیا؟"

"بھئی مجھے مت چھیڑو۔"

"ضرور چھیڑیں گے۔ اگر اپنی بیوی کو نہیں تو کیا کسی راہ چلتی عورت کو چھیڑیں۔"

"مجھے کیا پتہ؟ راستہ چلنے والوں کو بھی چھیڑتے ہوں گے جبھی تو عادت بگڑی ہوئی ہے۔"

"اچھا جی۔ اب ہمیں آوارہ بدمعاش کا خطاب مل گیا۔"

"..........."

"پہلے آوارگی کا طعنہ دیا اور پھر اُلٹی خود ہی چپ ہو گئیں۔ جلدی بولو نہیں تو گدگدی..........."

"میں ابھی چلاتی ہوں۔ اماں سنیں گی تو کیا سوچیں گی۔"

"یہی سوچیں گی کہ تمھیں پھر ہسٹریا کا دورہ پڑ رہا ہے۔"

"اچھا میں تو ہسٹریا کی بیمار پگلی سڑی ہوں۔ اور کیوں نہیں کر لیتے؟"

"ایک بار شادی کر کے کون سا سکھ پایا ہے۔ جو غلطی دوبارہ کروں۔"

"چلو اچھا ہوا۔ آج تم نے صاف صاف ہی کہہ دیا۔"

"کیا کہہ دیا؟"

"یہی کہ مجھ جنم جلی سے بیاہ کر کے تم نے دُکھ ہی دُکھ اُٹھایا ہے۔"

"تم سے تو کوئی مذاق کرنا بھی پاپ ہے۔"

"اب بات کو ٹالو مت، جو کہنا تھا وہ تو کہہ گئے۔"

"اچھا کہہ گئے۔ کر لو کیا کرتی ہو؟"

"میں بے چاری کر ہی کیا سکتی ہوں۔ ماں باپ آج زندہ ہوتے تو اُن کے پاس ہی چلی جاتی۔ بھائی ہے تو کبھی بھولے سے یہ نہیں پوچھتا کہ بہن زندہ ہے یا مر گئی۔ کروں گی کیا۔ کسی کنوئیں یا کھائی میں ایک دن ڈوب مروں گی۔"

"غیرت دار کے لئے تو چلّو بھر پانی ہی کافی ہے۔ کنوئیں کھائی کی کیا ضرورت ہے؟"

"ہاں، ہاں تم بھی یہی کہو۔ دن بھر تمھاری اماں کچو کے دیتی رہتی ہے، شام کو تم گالیاں سناؤ۔"

"آخر ہوا کیا، معلوم تو ہو۔"

"نہیں کیا، گھر سے تمھیں کوئی دلچسپی ہو تو معلوم ہو۔ بس سویرے اُٹھے اور دفتر چلے گئے۔ شام ہوئی آگئے۔ کھانا کھایا اور پڑ کر سو گئے۔......"

"تو کیا ہوا۔ سوتا بھی تو تمھارے......"

"بے شرمی کی بھی حد ہوتی ہے۔"

"مطلب یہ ہے کہ رات کو کوٹھوں پر تو بھٹکتا نہیں پھرتا۔ ریس کورس نہیں جاتا، شراب نہیں پیتا، جوا نہیں کھیلتا......"

"اور یہ ہر مہینے جو دس دس روپے کراس ورڈ پر لگاتے ہو یہ جوا نہیں تو کیا ہے؟"

"اب تم جاہل کیا جانو کہ یہ تو دماغی ورزش ہے۔"

"اچھا میں تو بالکل گنوار ہوں۔ اب کے کوئی بی۔ اے۔ ایم۔ اے کو لانا۔ جو ناک چنے نہ چبوا دے۔ جب کوئی دوسری سوا سو روپے میں گھر چلا کر دکھا دے گی۔ تب جانوں گی۔"

"دنیا میں لاکھوں ایسے بھی ہیں جنھیں سوا سو روپے ماہوار بھی نہیں ملتا۔"

"ہاں ہوں گے۔ مگر وہ دن میں دو دو تین تین بار چائے نہیں پیتے۔ نہ ہر تیسرے دن سینما دیکھتے ہیں۔"

"تیسرے دن؟ جھوٹ بولو تو ایسا تو نہیں کہ آسمان پھٹ پڑے۔ مشکل سے مہینے میں ایک بار تو جاتا ہوں۔"

"کیوں؟ پچھلے ہفتے ہی دو بار نہیں گئے تھے؟"

"مگر دوسری بار تو مفت گیا تھا۔ فری پاس سے۔"

"اور تانگے کا کرایہ؟ چائے، پان، سگریٹ؟ وہ سب بھی مفت ملا تھا؟"

"اب تم یہ چاہتی ہو کہ دن بھر دفتر میں مغز زنی کرکے سپرنٹنڈنٹ کی گالیاں اور صاحب کی جھڑکیاں سننے کے بعد آدمی کبھی گھڑی بھر تفریح بھی نہ کرے۔"

"کرو، شوق سے کرو، مگر اس سے پہلے مجھے اور دونوں بچوں کو زہر دے دو۔"

"پاگل پن کی باتیں مت کرو۔ بچوں بے چاروں کو کیوں دھر گھسیٹا؟"

"اس لیے کہ ننھے کا نام اسکول سے کٹ گیا ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا ہم فیس نہیں دیتے؟"

"فیس نہیں دی ہے تبھی تو کٹا ہے۔"

"اوہ ـــــ میں تو اس مہینے بھول ہی گیا تھا ـــــ مگر فیس بھی تو کتنی بڑھ گئی ہیں۔"

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ فیس کے روپے تمھارے کراس ورڈ کے کلیجے میں گھس گئے۔"

"مگر اس بار پچاس ہزار کا انعام تھا۔ یہ موقع کیسے چھوڑ دیتا۔"

"تو کون سا پچاس ہزار کا انعام تمھیں مل گیا۔ تین برس تو ہو گئے اسی کوشش میں۔ کبھی ایک دھیلا نہیں ملا۔ مجھے تو یہ سراسر دھوکے کا دھندا لگتا ہے۔"

"کیوں، پارسال چار غلطیوں پر وہ چاندی کی پنسل نہیں ملی تھی۔"

"چاندی کی تھی وہ؟"

"چلو اصلی چاندی کی نہ سہی، چاندی کی طرح چمکتی تو تھی؟"

"جی، اور پندرہ ہی دن میں ساری چمک اڑ کے اندر سے پیتل نکل آیا تھا۔"

"جب تمھیں اچھی چیزوں کا استعمال ہی نہیں آتا تو اور کیا ہو گا۔ منّی اس سے مزے سے ڈھول بجاتی تھی اور ننھا دیواروں پر تصویریں بناتا تھا۔ اور تم خود اس سے ازاربند ڈالنے کا کام لیتی تھیں۔"

"ہاں، جب تم ہزار بار کہنے پر بھی ازاربند ڈالنے کی لکڑی نہیں لا کر دیتے تو اور کس سے ڈالوں۔ اپنے سر سے؟"

"اچھا بھئی۔ اچھا۔ کل دو پیسے کی ازاربند ڈالنے کی لکڑی لا دیں گے۔ اگر یاد رہا۔"

"اجی تمھیں میری کہی ہوئی بات کیوں یاد رہنے لگی۔"

"کیوں، اور کوئی بات کبھی بھولا ہوں۔ پرسوں ہی چائے کا ڈبہ لا کر نہیں دیا تھا۔"

"میں کون سی چائے کی شوقین ہوں، لائے ہوں گے تو اپنے شوق کے لئے۔"

"اچھا اسی بات پر چائے پلاؤ۔"

"پلاؤں کیا خاک، گھر میں شکر ہی نہیں ہے۔"

"شکر نہیں ہے؟"

"ہاں، ہاں بہرے ہو گیا۔ کہہ دیا ایک بار شکر نہیں ہے۔"

"چوتھا دن ہے تو راشن آیا تھا۔"

"مگر کتنا؟ یہ بھی سوچا ہے۔ چار کارڈوں پر آٹھ چھٹانک۔ ہفتے بھر کے لئے۔"

"میں تو دو چمچے ہی ڈالتا ہوں۔"

"مگر تمھارے سارے دوست تو چار چار چمچے ڈالتے ہیں۔ جو روز سویرے یہاں دھرے رہتے ہیں۔"

"تو کیا میں ان کے یہاں چائے نہیں پیتا؟"

"بس تو آج بھی وہیں جا کر پی آؤ۔"

"اچھا خفا مت ہو، ہم گڑ ہی کی پی لیں گے۔"

"اور دودھ کی جگہ کیا ڈالو گے؟"

"کیوں دودھ بالکل نہیں بچا؟"

"ایسا کون دو تین سیر دودھ منگاتے ہو؟......... تین پاؤ میں بھی بچوں کو صرف ایک وقت پاؤ بھر ملتا ہے۔ وہ بھی آدھے سے زیادہ پانی

ہی ہوتا ہے۔ دیکھو تو سہی دونوں کا چمڑا اٹھڈی کو لگ گیا ہے۔ پاؤ بھر چائے، کو بچتا ہے۔ اب چاہے سویرے چار چار دوستوں کو چائے پلادو، چاہے شام کے لئے رکھ لو۔"

"اچھا چھوڑو۔ کنڈنسڈ ملک کا ڈبہ لے آتے ہیں۔"

"لے آؤ۔ مگر مجھ سے پیسے نہ مانگنا۔"

"تو میرے پاس پیسے کہاں سے آئے۔ بس تین آنے ہیں......"

"کیوں صبح تو ڈیڑھ روپیہ تھا جیب میں........"

"چار آنے تو بس میں لگ گئے۔ ایک آنے کا پان کھایا......."

"ہاں ہاں یہ تو میں بھی جانتی ہوں، پر وہ ایک روپیہ کیا ہوا، وہ اپنی کس چہیتی کو دے آئے۔"

"یونین کا چندہ دیا ہے۔"

"یونین! یونین! یہ نگوڑی میری سوتن نہ جانے کہاں سے آگئی ہے۔ جب دیکھو روپیہ مانگتی رہتی ہے۔ میں کہتی ہوں تم کوئی کارخانے کے مزدور ہو، جو تمھارے دفتر میں بھی یونین بن گئی........"

"تم تو کوئی بات سمجھتی نہیں۔ یونین ہی تو ہماری......"

"ہاں، ہاں یہ یونین ہی تمھاری بیوی ہے۔ تمھاری بچّی ہے۔ تمھاری ماں ہے۔ تو پھر اُسی سے جاکر کہو چائے پلائے تمھیں۔ گھر میں چاہے فاقہ ہو۔ بچّوں کے نام اسکول سے کٹ جائیں۔ مگر یہ ہیں کہ یونین نگوڑی کا چندہ ضرور دیں گے......... میں نے ہزار بار کہہ دیا کہ جنم جلی بیوی اور نگوڑی

یونین میں سے ایک کو پسند کرو۔ مجھے زہر دے دو اور پھر ساری کی ساری تنخواہ یونین ہی میں دے آیا کرو ...."

"روؤ مت۔ اب تنخواہ ہی نہیں ملا کرے گی۔ آج ہی کمپنی نے چالیس کلرکوں کو نوٹس دیئے ہیں۔"

"تمھیں بھی ؟"

"ہاں ۔"

"یہی بات کہنا چاہتے تھے ؟"

"ہاں"

"پھر، اب کیا ہوگا ؟"

"جو ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔ مزدوروں اور سرمایہ دار کی جنگ۔ ہم لوگوں کی برطرفی غیر قانونی ہے۔ یونین نے اسٹرائک کا نوٹس دیا ہے۔"

"اسٹرائک ؟"

"ہاں سب کلرک، چپراسی تیار ہیں۔ اسٹرائک فنڈ جمع کیا جا رہا ہے۔"

"تمھیں اور کتنا دینا ہے ؟"

"پانچ روپے۔"

"........"

(تین گھنٹے بعد)

"اجی او۔ سو گئے۔"

"نیند نہیں آرہی۔"

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"یہی کہ دنیا کب بدلے گی؟ اور کل سویرے پانچ روپے کہاں سے آئیں گے؟"

"پانچ روپے ——— یہ لو۔"

"یہ کہاں سے آئے؟"

"میں نے بچا کر رکھے تھے۔ برسات میں تمہارے لئے چھتری لینے کو۔"

"اور اب یہ روپے یونین کو دے رہی ہو ——— اپنی سوتن کو۔"

"سوچتی ہوں یہ طوفان جو آیا ہے اس میں شاید یونین ہی چھتری کا کام دے گی۔"

"..........."

"ہائے، تم مرد ہو کر روتے ہو......"

"یہ خوشی کے آنسو ہیں۔"

"خوشی کے؟"

"ہاں، تم کتنی اچھی ہو۔"

"............."

"گچی! گچی!!"

"کیوں کیا ہے؟"

"کچھ نہیں بس۔ گچی! گچی!!"

تین تصویریں

قصائی کی مسیحائی

بیمار لڑکی کا چہرہ خون کی کمی سے پیلا پڑ چکا تھا۔ پیلا۔ بلکہ سفید۔ جیسے وہ چادریں جن میں لپٹی ہوئی وہ آپریشن ٹیبل پر لیٹی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر کے انتظار میں۔ لڑکی کی آنکھوں میں خوف تھا۔ اور ایک گہری مایوسی جیسی اُس بکری کی آنکھوں میں ہوتی ہے جسے مذبح خانے میں لے جایا جا رہا ہو۔

لفٹ کا دروازہ کھُلا اور اس میں سے ڈاکٹر نمودار ہوا۔ اُس نے ایک نظر کلائی کی گھڑی پر ڈالی۔ پھر بیمار لڑکی کے پریشان رشتے داروں کی طرف دیکھ کر مسکراتا ہوا اندر چلا گیا۔ اور اُس وقت اُن کو ڈاکٹر کی مسکراہٹ اتنی ہی بے رحم اور ظالمانہ معلوم ہوئی جیسے کوئی قصائی بکری ذبح کرنے سے پہلے چھُری تیز کرتے ہوئے مسکرا رہا ہو۔

آپریشن کے کمرے میں ہر طرف سفیدی ہی سفیدی چھائی ہوئی تھی۔ سفیدی کی ہوئی دیواریں۔ سفید کپڑے پہنے ہوئے ڈاکٹر اور نرسیں۔ سروں پر

سفید ٹوپیاں۔ منہ پر سفید کپڑے کی نقابیں جن میں سے صرف آنکھیں چمکتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ چمکیلے تیز دھار والے اوزار جن سے آپریشن کیا جائے گا۔ بڑے نشتر۔ چھوٹے نشتر۔ قینچیاں۔ ہڈیاں کاٹنے کی آریاں۔ ہتوڑے۔ انجکشن دینے کی سوئیاں۔ آکسیجن کے سلنڈر۔ خون چڑھانے کے لیے بوتلوں میں بھرا ہوا پلازما۔ کلوروفارم کی بو۔ اور عین اُس کے سر پر لٹکا ہوا تیز روشنی کا بجلی کا لیمپ۔ چندھیا نے والی روشنی۔ سورج جو آسمان سے زمین پر اُتر آیا تھا۔ ناچتے ہوئے ستارے۔ سینے میں دم گھٹتا ہوا۔ گھومتی ہوئی ہر چیز۔ گھومتی ہوئی زمین۔ گھومتا ہوا آسمان۔ مدھم آوازیں جیسے دوسری دنیا سے آرہی ہوں......
میٹھی گہری نیند...... آرام بھری موت.........

مشین کی طرح سدھے ہوئے ہاتھوں نے ایک نشتر اُٹھایا......
ربڑ کے دستانے پہنے ہاتھوں نے مکانیکی، غیر جذباتی طریقے سے ننگے پیٹ کو دباکر دیکھا...... جیسے قصائی ذبح کرنے سے پہلے جانور کی گردن پر ہاتھ پھیرتا ہے...... اور پلک جھپکتے، نشتر کی ایک جنبش سے پیٹ کو چاک کر ڈالا...... خون بہہ نکلا۔ مگر ڈاکٹر کے مشینی ہاتھوں میں کوئی رعشہ نہیں پیدا ہوا...... نہ اُس کی چمکتی آنکھوں میں رحم یا ہراس کے آثار نظر آئے...... اطمینان سے جیسے کوئی پنسل تراش رہا ہو وہ کھال کی ایک تہہ کے بعد دوسری تہہ کو کاٹتا چلا گیا...... اور پھر اُس کے ہاتھ شگاف کے اندر غائب ہوئے، اور خون میں لت پت آنتوں کا ایک گورکھ دھندا سنبھالے باہر نکل آئے...... آنتوں کے گچھے میں سے "مریض" آنت کو

تلاش کیا، سدھی ہوئی انگلیوں نے ایک گرہ لگائی اور قینچی کی ایک ہلکی سی "اپنڈکس" کو اس اطمینان سے کاٹ دیا گیا ...... جیسے باربر بالوں کی لٹ کو کاٹ دیتا ہے ....

پھر آنتوں کو پیٹ میں واپس رکھ دیا گیا...... کھال کی ہر تہہ کو درزی کی چابک دستی کے ساتھ ٹانکے لگا دیئے گئے ...... اور زخم پر پٹی باندھ دی گئی ...... بیمار لڑکی کے ٹخنے کے پاس ایک رگ میں خون پہنچانے کے لئے سوئی لگا دی گئی اور بے ہوشی کی حالت ہی میں اُسے پہیوں دار اسٹریچر پر لٹا کر اس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا ......

ڈاکٹر نے اطمینان سے ربڑ کے دستانے اُتارے۔ جو ابھی تک خون اور پیپ میں لت پت تھے۔ پھر صابن سے ہاتھ دھوئے۔ سفید ٹوپی اور نقاب اور لبادہ اتار پھینکے۔ پھر اُس نے جیب سے سگریٹ کیس اور لائیٹر نکالا اور سگریٹ کا دھواں چھوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔

باہر لڑکی کے پریشان رشتے دار ڈاکٹر کے فیصلے کے انتظار میں کھڑے تھے۔

"سب ٹھیک ہے" ڈاکٹر نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا ......

نہ جانے اس ظالم مسکراہٹ میں کسی مہاتما کا روحانی اطمینان قلب تھا یا کسی شیطان کی بے رحم غیر جذباتیت !۔ پھر وہ اس خطرناک آپریشن کو بھلا کر دوسرے آپریشن کی تیاری کرنے لگا۔ ایسا لگتا تھا کہ نہ اسے مریض کی صحت کی فکر ہے اور نہ اس کا احساس ہے کہ ابھی ابھی اس نے اپنے نشتر سے کسی کی زندگی اور موت کا فیصلہ کیا ہے۔

یہ ڈاکٹر کیسے ہوتے ہیں؟ دیوتا یا راکھشس؟ ظالم قصائی یا رحم دل مسیحا؟ آپریشن کرنے کی غیر جذباتی مشینیں یا شانِ خدائی کے مظہر؟ ایک بات یقینی ہے کہ وہ معمولی انسان نہیں ہوتے۔

سیاست داں اور اخلاقیات کے ماہر سینکڑوں برسوں سے ــــ (ENDS AND MEANS) کی بحث میں پڑے ہوئے ہیں۔ کیا اچھے مقاصد کے لئے بُرے اور تشدد بھرے طریقے استعمال کئے جا سکتے ہیں؟ کیا امن کی بقا کے لئے جنگ جائز ہے؟ کیا انسانی آزادی اور انسانی بہبودی کے لئے خون بہانا روا ہے؟

شکر ہے کہ ڈاکٹر اور سرجن اس اخلاقی الجھن میں نہیں پڑتے۔ شکر ہے کہ وہ جذباتیت کے شکار نہیں ہوتے۔ ورنہ وہ زندہ انسانوں کی چیر پھاڑ اس اطمینان اور یقین اور صفائی کے ساتھ نہ کر پاتے۔ جو کسی آپریشن کی کامیابی کے لئے ضروری ہے۔ اور ہزاروں جانیں جواب سرجری کے معجزے سے موت کے مُنہ سے نکال لی جاتی ہیں کانپتے ہوئے رحم دل ہاتھوں کا شکار ہو جاتیں!

کیا زندگی بھی ایک عملِ جراحی نہیں۔ جس میں سماج کے مفلوج اور گلے سڑے عنصر انقلاب کے نشتر سے کاٹ کر پھینک دیئے جاتے ہیں۔

بچّوں کا کھیل

دو بچیاں کھیل رہی ہیں۔ بمبئی کی کسی بلڈنگ میں۔

دو بچیاں کھیل رہی ہیں۔ اس میں قابلِ ذکر بات کیا ہے؟ اُن کے خاندان ایک ہی پڑوس .... بلکہ برابر برابر کے فلیٹ .... میں رہتے ہیں۔ قدرتی بات ہے کہ پڑوسیوں کے بچے ایک دوسرے کے ساتھ کھیلتے ہیں۔

مگر ان دونوں بچیوں کا ساتھ کھیلنا ایک وجہ سے قابلِ ذکر ہے ..... اور اسی وجہ سے ان کے کھیل میں ایک ٹریجڈی چھُپی ہوئی ہے۔

ایک بچی کے ماں باپ سِکھ ہیں جن کو تقسیم کے بعد مغربی پنجاب میں اپنے وطن کو چھوڑ کر بمبئی جیسی دور دراز جگہ آنا پڑا۔

دوسری بچی کے ماں باپ مسلمان ہیں۔ جن کو مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے پاکستان جانا پڑا۔ آج کل وہ اپنے رشتے داروں سے ملنے بمبئی آئے ہوئے ہیں۔

وہ دونوں گڑیاں کھیل رہی ہیں۔ اور اُن کو نہ اس کا علم ہے نہ اس کی پرواہ ہے کہ ایک کے ماں باپ مسلمان ہیں اور دوسری کے سِکھ۔ اس کھیل کے لئے نہ انھوں نے پاکستان مسلم لیگ کی اجازت لی ہے نہ شرمونی اکالی دَل کی۔ وہ کھیل رہی ہیں ...... خنجروں اور کرپانوں، چاقوؤں اور لکڑیوں کا کھیل نہیں بلکہ گڑیوں کے بیاہ کا صدیوں پُرانا کھیل۔ ایک کی گڑیا کے بیاہ دوسری کے گڈے سے رچایا جا رہا ہے ...... مگر یہ نہیں معلوم کہ گڑیا اور گڈے میں سے کون مسلمان ہے اور کون سکھ؟ اور ان بچیوں کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ "رانی" اور "بابلی" میں سے کون سی بچی مسلمان ہے اور کون سی

سکھ ہے۔

یہ بچیاں معصوم ہیں۔ مگر دونوں خطرناک اور مشتبہ ہیں۔ وہ ایک "خطرناک" اور "قابلِ اعتراض" کھیل کھیل رہی ہیں .... امن اور اتحاد اور دوستی کا کھیل۔ ایسے کھیل کھیلنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیئے۔ کسی کو چاہیئے کہ انھیں روکے۔ انھیں بتائے کہ مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان محبت اور دوستی نہیں عداوت ہونی چاہیئے۔ کسی کو چاہیئے کہ اُن سے کہے کہ سکھ اور مسلمان کی شادی گُڑیوں کی دنیا میں بھی ناجائز ہے۔ کسی کو چاہیئے کہ انھیں ایک دوسرے سے نفرت کرنا سکھائے۔ ایک دوسرے سے ڈرنا سکھائے۔ کسی کو چاہیئے کہ اُن میں سے ایک کے ہاتھ میں اسلامی خنجر دے اور دوسری ہاتھ میں سکھ کرپان .... آج نہیں تو کل یہ سارے سبق انھیں ضرور پڑھائے جائیں گے!

مگر ہوسکتا ہے کہ یہ بچیاں .... اور ان جیسے ہندوستان اور پاکستان کے کروڑوں بچے .... اپنی معصومیت کے جھنڈے تلے نفرت اور دشمنی کے علمبرداروں کے خلاف جہاد کا اعلان کردیں اور بچوں کا یہ کھیل دو مُلکوں اور دو قوموں کے اتحاد کا پیش خیمہ ثابت ہو!

گیت کا جنم

ایک فلم سٹوڈیو میں (جس کا نام لینے کی ضرورت نہیں) ایک میوزک ڈائرکٹر (جس کا نام بتلانے کی بھی ضرورت نہیں) ایک گانے کا ریہرسل

کر رہا ہے۔ فی الحال اس فلم کا نام یا اس گیت کی پہچان بتانے کی بھی کوئی خاص ضرورت نہیں۔

یہ ایک کورس گیت ہے۔ پچاس آوازوں کا کورس۔ پچیس لڑکوں کی آوازیں۔ پچیس لڑکیوں کی آوازیں۔

بھاری مردانہ آوازیں۔ پتلی زنانہ آوازیں۔ سُریلی آوازیں۔ میٹھی آوازیں۔ گھنٹی جیسی آوازیں۔ بانسری جیسی آوازیں۔ سدھی ہوئی آوازیں۔ "نوسیکھی" آوازیں۔ کراری آوازیں۔ نرم آوازیں۔ اونچی آوازیں۔ نیچی مدہم آوازیں۔ "خودسر" آوازیں جو کورس سے آگے بھاگی جا رہی ہیں..... تھکی ہوئی آوازیں۔ جو کورس کے کارواں سے پیچھے رہ گئی ہیں۔ اور میوزک ڈائرکٹر کی زبان کا چابک ان سب کو ایک لائن میں رکھے ہوئے۔

لڑکیوں کے کورس کو ایک مہاراشٹری لڑکی "لیڈ" کر رہی ہے۔ اور لڑکوں کے کورس کو ایک بنگالی نوجوان۔ کورس میں بنگالی آوازیں، آسامی آوازیں، گجراتی، مرہٹی اور سندھی آوازیں، پنجابی اور کشمیری آوازیں، راجستھانی اور گوانی آوازیں۔ ہندو آوازیں، مسلم آوازیں، پارسی، سکھ اور کرسچین آوازیں!

گانے والیوں میں امیر گھرانوں کی لڑکیاں (قیمتی زیور اور ریشمی ساڑھیاں پہنے ہوئے)، بھی ہیں جو صرف شوقیہ گانے آئی ہیں، اور غریب مزدور پیشہ لڑکیاں بھی جن کے چہروں پر ان کی تنگ دستی کی داستان لکھی ہوئی ہے۔ گانے والوں میں کالج کے لڑکے بھی ہیں۔ دفتروں کے

کلرک بھی جو سہگل بننے کے خواب دیکھ رہے ہیں، اور فلموں کے ایکسٹرا بھی جو اس ذریعے سے فلمی دنیا میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔

وہ بھی ہیں جن کو موسیقی اپنے ماں باپ سے ورثے میں ملی ہے۔ اور وہ بھی جنھوں نے گھر والوں سے چھپ کر گانا سیکھا ہے۔ وہ بھی ہیں جن کی آوازیں قدرتی طور پر سُریلی ہیں۔ اور وہ بھی جنھوں نے برسوں کی محنت سے سُر اور لے پر قابو پایا ہے۔ "باتھ روم سنگر" بھی ہیں اور میوزک کالجوں کے سند یافتہ سنگیت کار بھی۔

اور تو اور سازندوں میں تین دھوبی بھی ہیں۔ جو سیدھے دھوبی گھاٹ سے لائے گئے ہیں۔ اس عوامی کورس میں جان ڈالنے کے لیے۔ اور جو اپنے ڈھولک اور منجیروں کو اسی بے دردی سے پیٹ رہے ہیں جیسے ہمارے آپ کے کپڑوں کو دھوبی گھاٹ کے پتھروں پر دے دے مارتے ہیں۔

یہ پچاس آوازوں کا فلمی کورس گیت نہیں ہے۔ یہ ہندوستان ہے۔ غریب ہندوستان۔ امیر ہندوستان۔ تعلیم یافتہ ہندوستان۔ جاہل ہندوستان۔ ٹھیٹھ ہندوستانی ہندوستان۔ اور مغرب زدہ ہندوستان۔ اور اس کورس کو آج ہم آہنگ ہونا ہے۔ ان غریب دھوبیوں کے گنوار ساذوں کے ساتھ۔ "نیا راگ ہے ساز بدلے گئے"۔

اور تمام وقت میوزک ڈائرکٹر جو پسینے میں نہایا ہوا ہے مسکرا رہا ہے، خفا ہو رہا ہے، چلّا رہا ہے، ڈانٹ رہا ہے، پچکار رہا ہے، تعریف کر رہا ہے، غلطی نکال رہا ہے، ساتھ مل کر گا رہا ہے، ڈھولک والے کو ڈھولک بجا کر

تمارہا ہے...... اور اس کی آنکھیں خوشی اور جوش سے چمک رہی ہیں اور اس کے ہاتھ لَے پر ناچ رہے ہیں...... اور اس طرح وہ ان الگ الگ آوازوں کو، ان الگ الگ سازوں کو، اچھی آوازوں اور بُری آوازوں کو، اونچی آوازوں اور نیچی آوازوں کو، ہارمونیم اور طبلے کو، وائلن اور بانسری کو ہم آہنگ کر رہا ہے، ایک سُر اور ایک لَے میں لا رہا ہے...... بے ہنگم شور کو خوب صورت گیت میں تبدیل کر رہا ہے۔

دور کھیتوں میں گنگناتی ہوئی کسان عورتیں۔ اُمنگ بھری جوانی کے گیت۔ ڈھولک کی تھاپ۔ صدیوں کے دُکھ اور درد سے بھری تانیں۔ ظلم اور استبداد کے کوڑے تلے اُبھرتے ہوئے انقلابی گیت۔ عورتوں کی درد بھری پکار اور مردوں کی جوشیلی للکار......

یہ سب کچھ اس ایک گیت میں ہے۔ اس لئے کہ یہ گیت ہندوستان کی طرح مختلف آوازوں اور مختلف سازوں کی ہم آہنگی سے پیدا ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ یہ اتحاد کا کورس ہے جو انقلاب کی لَے پر گایا جا رہا ہے۔

ڈیڈ لیٹر

"ڈارلنگ"

"جی"

"پرشاد نے آج شام کو برج اور کھانے کے لئے بلایا ہے۔ یاد ہے نا؟"

"جی"

"تو میں آفس سے کوئی ساڑھے پانچ تک آجاؤں گا۔ تم تیار رہنا۔"

"جی"

جی! جی!! جی!!! بارہ برس سے وہ یہ دو حرفی لفظ اپنی بیوی کی زبان سے سن رہا تھا۔ دس باتوں میں سے نو کا جواب وہ صرف "جی" سے دیتی تھی۔ جیسے پڑھایا ہوا طوطا جو صرف ایک لفظ بول سکتا ہو جی! جی!! جی!!!

سدھیر سکسینہ۔ آئی۔ سی۔ ایس ڈپٹی کمشنر ضلع نرائن گنج کے بارے میں ہر ایک کی رائے تھی کہ دنیا میں اس سے بڑھ کر خوش قسمت کوئی نہ ہوگا۔ اونچا

عہدہ، اچھی تنخواہ، رہنے کے لئے آرام دہ مکان، بلا جیسی حسین، سلیقہ مند، اور پڑھی لکھی بیوی جو کمشنر صاحب کے ساتھ برج کھیل سکتی تھی۔ راجہ صاحب رام نگر کے ساتھ ڈانس کر سکتی تھی۔ سوسائٹی میں ملنے جلنے اُٹھنے بیٹھنے کے سب قاعدے قانون جانتی تھی۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ تین خوب صورت اور ذہین بچوں کی ماں تھی۔ سب سے بڑا رندھیر جو دس برس کی عمر ہی میں نینی تال کے ایک انگریزی اسکول میں جونیر کیمبرج میں پڑھ رہا تھا۔ اور اپنی کلاس کی کرکٹ ٹیم کا کپتان تھا۔ اور بالکل اینگلو انڈین لڑکوں کی طرح انگریزی بولتا تھا۔ اس سے چھوٹی سات سالہ اوشا جو ماں کی طرح ہی دُبلی پتلی اور نازک تھی۔ اور ویسی ہی بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔ اور ویسے ہی گھونگروالے بال تھے۔ وہ نرائن گنج ہی کے ایک کانونٹ اسکول میں تھرڈ اسٹینڈرڈ میں پڑھ رہی تھی۔ اور اسے سارے نرسری رہائمز زبانی یاد تھے۔ اور "ٹونکل ٹونکل لٹل اسٹار" جیسی نظمیں، تو وہ فرّاٹے سے گا کر سُنا سکتی تھی۔ اور پھر سب سے چھوٹی شانتی جو ابھی مشکل سے تین سال کی تھی۔ اور "بے بی" کہلاتی تھی۔ اور ماں باپ دونوں کی آنکھوں کا تارا تھی۔ اور بڑے پیارے انداز سے تتلا تتلا کر "ڈیڈی ٹاٹا" یا "ممی بائی بائی" کہنا سیکھ رہی تھی.........

ہاں تو سب ہی سدھیر سکسینہ آئی۔سی۔ایس کو انتہائی خوش قسمت سمجھتے تھے۔ اور کبھی کبھی وہ خود بھی یہی سمجھتا تھا۔ جو کچھ اسے حاصل تھا اس سے زیادہ زندگی میں کوئی کس چیز کی امید کر سکتا ہے؛ مگر جب وہ اپنی بیوی کی زبان سے یہ دو حرفی لفظ "جی" سنتا...... بملا کے مخصوص، پھیکے، بے رنگ،

تھکے ہوئے انداز میں .... تو اس کی خوشی اور خوش قسمتی دونوں پر شک اور شبہہ اور ایک عمیق مایوسی کے بادل چھا جاتے۔

"جی!"

کب سے یہ لفظ اس کی زندگی میں گونج رہا تھا۔

تیرہ برس ہوئے وہ پہلی بار مسوری میں ملے تھے۔ سدھیر مہینہ بھر پہلے ہی انگلستان سے آیا تھا۔ اور تقرر ہونے سے پہلے چند ہفتے چھٹی منانے آیا ہوا تھا۔ مسوری کھاتے پیتے گھرانوں کی خوب صورت، خوش پوشاک اور دلچسپ لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ لائبریری کے سامنے ہر شام کو لہراتی ہوئی رنگین ساڑھیوں، چست قمیضوں، ریشمی شلواروں اور گلے میں جھولتے ہوئے دوپٹوں کی نمائش ہوتی تھی۔ اونچی ایڑی کے جوتوں پر اٹھلاتی ہوئی چال، بے باک نگاہیں، شوخ جوانیاں، بانکی چتونیں، ولایتی سینٹ میں ڈوبے ہوئے ہوا کے جھونکے۔ گلنار لب، موچنے سے باریک کیے ہوئے کمان جیسے ابرو، غازے سے دمکتے ہوئے گال، کٹے ہوئے اور "پرم" کیے ہوئے گیسو۔ ہر نوجوان کے شوقِ نظارہ کو دعوتِ عام تھی۔ مگر نہ جانے کیوں سدھیر کو سارے مسوری میں صورت پسند آئی تو صرف ایک۔ بملا جس سے پہلی بار اس کی ملاقات "ہیکمینز" ہوٹل میں ایک شام کو "ٹی ڈانس" کے دوران میں ہوئی تھی۔

"ہیلو سدھیر" اس کے پٹنہ کے دوست ماتھر نے اسے ہاتھ سے اشارہ کرکے اپنی میز کی طرف بلاتے ہوئے کہا تھا "یہاں آؤ یار۔ اور ان سے ملو۔

آپ ہیں مس ببلا بنیرجی، ہیں بنگالی مگر لکھنؤ میں پلی ہیں۔"

سدھیرے نے دیکھا کہ بغیر پاؤڈر کے گورے چہرے پر دو بڑی بڑی آنکھیں ہیں۔ جن کی گہرائی میں کوئی غم ڈوبا ہوا ہے اور ان کے گرد سیاہ حلقے ہیں اور لمبی گھنیری، شرمیلی پلکیں ہیں۔ جو راتوں کو جاگے ہوئے پپوٹوں کے بوجھ سے جھکی جا رہی ہیں۔

وہ ماتھر کے اصرار کا انتظار کئے بغیر ہی ببلا کے قریب کی کرسی پر بیٹھ گیا، اور پھر اس کے لئے اس کھچا کھچ بھرے ہوئے بال روم میں ببلا کے سوا اور کوئی نہ تھا۔

بارہ برس کے بعد بھی ان کی وہ سب سے پہلی گفتگو آج تک اس کی یاد میں تازہ تھی۔

"تو آپ آئی۔ ٹی کالج میں پڑھتی ہوں گی؟"

"جی!"

"بی۔ اے میں؟"

"جی!"

"اگلے سال فائنل کا امتحان دیں گی؟"

"جی"

دو برس تک انگریز عورتوں کی کرخت مردانہ آوازوں کو سننے اور دو ہفتے مسوری کے شور و غل میں گزارنے کے بعد۔ کتنا سکون تھا ببلا کی کم گوئی میں۔ جیسے آندھی اور طوفان اور کڑک چمک کے بعد بارش تھم گئی ہو۔ اور گلاب

کی پتّیوں پر سے چند ننھی ننھی بوندیں گھاس پر ٹپک رہی ہوں کیتنی ہندوستانیت تھی اس "جی!" میں۔ کتنی ملائمت اور مٹھاس! کتنی معصومیت اور حیا!

"آپ ڈانس کرتی ہیں؟"

"جی نہیں"

ان کے دوست ناچنے والوں کی بھیڑ میں کھو گئے تھے۔ اور اب وہ دونوں اپنی میز پر اکیلے تھے۔ سدھیر نے سوچا۔ آخرکار میری تلاش آج ختم ہو گئی۔ بھلا اس سے بہتر بیوی مجھے نہیں مل سکتی۔ وہ حسین ہے۔ مگر شوخ تتلی نہیں جو ایک پھول سے دوسرے پھول پر بھٹکتی پھرے۔ پڑھی لکھی ہے۔ مگر خود رائے اور زبان دراز نہیں۔ کھاتے پیتے گھرانے کی معلوم ہوتی ہے مگر اتنی امیر بھی نہیں۔ کہ ایک آئی، سی، ایس کی درخواست کو ٹھکرا دے۔ اس سے شادی کرکے انسان واقعی سُکھ اور سکون کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔

اور اس نے کہا "تو آپ کے پتا.........."

"وہ لکھنؤ میں رہتے ہیں۔ آرٹ اسکول میں پڑھاتے ہیں۔"

"اوہ آپ آرٹسٹ بنرجی کی بیٹی ہیں۔ ان کی تصویروں کی نمائش تو ہمارے پٹنہ میں بھی ہو چکی ہے۔" اور پھر اس نے صفائی سے جھوٹ بولا "مجھے ان کی تصویریں بہت پسند آئی تھیں۔" حالانکہ اس وقت اس نے سوچا تھا کہ نہ جانے ان ٹیڑھی میڑھی لکیروں اور نیلے پیلے رنگ کے دھبّوں میں کیا دھرا ہے جو لوگ ان کی اتنی تعریف کرتے ہیں۔ مگر اسی لمحے اسے ان تصویروں میں سے ایک خاص تصویر یاد آ گئی۔ ایک گیارہ بارہ سالہ شوخ و شریر بچّی کی تصویر جو

صابن گھلے ہوئے پانی کے رنگین بلبلے بنا کر اڑا رہی تھی۔ تصویر کا نام تھا "بلبلے"۔

"وہ تصویر "بلبلے" آپ کی ہی تھی نا؟"

"جی!"

"اس میں آپ بہت شریر معلوم ہوتی تھیں۔ اب تو آپ کتنی سیریس ہو گئی ہیں"۔

صرف اس بار اس نے جی کہہ کر جواب نہیں دیا۔ ایک عجیب سی تھکی ہوئی، بجھی ہوئی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی: "بلبلے کی زندگی ہی کتنی ہوتی ہے۔ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا اور بلبلا ٹوٹ گیا۔ بس ختم"۔

جب تک وہ مسوری رہا اس کا بیشتر وقت بملا کی رفاقت میں گزرا۔ اکٹھے وہ چینڈال چوٹی تک چڑھے۔ کیمل بیک روڈ کے گرد گھومے، کیمپٹی فال پکنک کے لیے گئے۔

اس تمام عرصے میں بملا نے مشکل سے ایک درجن جملے اس سے کہے ہوں گے۔ سدھیر کی باتوں کو وہ بڑی خاموشی اور توجہ سے سنتی، جب تک وہ براہِ راست سوال نہ کرتا۔ وہ کسی بات پر بھی اپنی رائے کا اظہار نہ کرتی۔ مگر سدھیر کو بملا کی کم گوئی سے کوئی شکایت نہ تھی۔ باتونی لڑکیاں جو دنیا کے ہر مسئلے پر رائے رکھتی ہیں۔ اور اس کا اظہار ضروری سمجھتی ہیں اسے بالکل پسند نہ تھیں۔ اسے تو یہی اچھا لگتا تھا۔ کہ وہ بولتا جائے اور بملا بیٹھی سنتی رہے اور "جی۔ جی" کرتی رہے۔ جب سدھیر کو یقین ہو گیا کہ وہ بملا کو بہت پسند کرنے لگا ہے۔ بلکہ شاید محبت بھی کرنے لگا ہے۔ تو ایک دن تنہائی میں موقع پا کر

اس نے "پروپوز" کر ہی ڈالا۔

"بملا۔ تمھیں معلوم ہے نا کہ میں تمھیں بہت پسند کرتا ہوں۔"

"جی!"

"تمھارے بغیر میں نہیں رہ سکتا۔ کیا تم مجھ سے شادی کروگی؟"

"جی!" اس "جی" میں سوال بھی تھا اور جواب بھی۔

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد وہ بولی "دیکھیے، میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں۔ اس لئے میں آپ کو دھوکے میں رکھنا نہیں چاہتی۔ میں آپ سے محبت نہیں کرتی۔"

"کیا تم کسی اور سے محبت کرتی ہو؟"

بملا کی زبان سے "جی نہیں" شاذونادر ہی نکلتا تھا۔ مگر اس بار اس نے کہا "جی نہیں" اور پھر ایک پل کی خاموشی کے بعد جس میں گہری ٹھنڈی سانس کا شائبہ تھا "ایسا کوئی نہیں ہے۔"

سدھیر کو اطمینان ہوگیا۔ اس نے کہا "تو پھر کوئی حرج نہیں۔ میں تمھیں اپنے سے محبت کرنا سکھا دوں گا۔"

اُس دن جولائی ۱۹۴۰ء کی چودہ تاریخ تھی۔

نوکر نے ڈاک کا پلندہ ناشتے کے میز پر سدھیر کے سامنے لاکر رکھا۔ سب سے پہلا ہی خط جو اس نے کھولنے کے لئے اٹھایا تو اس کی نظر ڈاکخانے کی مہر پر پڑی "نرائن گنج۔ چودہ جولائی ۱۹۵۲ء" دفعتاً سدھیر کی یاد میں

پورے بارہ برس پہلے کا وہ دن چونک کر بیدار ہو گیا۔

لفافے کو چھری سے چاک کرتے ہوئے۔ سدھیر نے بملا سے پوچھا "جانتی ہو آج کیا تاریخ ہے؟"

"جی!" اور اس کی نظر سامنے کی دیوار پر لگے ہوئے کیلنڈر کی طرف گئی۔

"بارہ برس پہلے کا وہ دن یاد ہے مسوری میں ___ جب میں نے تمھیں پرپوز کیا تھا؟"

"جی" مگر اس "جی" میں صرف اقرار تھا کوئی گرمجوشی نہ تھی۔ سدھیر بارہ سال پہلے کی جس راکھ کو کریدنا چاہتا تھا۔ وہ بالکل ٹھنڈی تھی۔ ایسا لگتا تھا اس میں کبھی بھی کوئی چنگاری نہ تھی۔

مگر سدھیر نے بملا کے چہرے پر ایک رنگ جاتے اور دوسرا آتے نہیں دیکھا۔ وہ خط کھول کر پڑھ رہا تھا۔ جو اس کے کالج کے پرانے اور بے تکلف دوست ماتھر کے پاس سے آیا تھا۔ جو اب پٹنہ میں وکالت کرتا تھا۔ خط پر نظر ڈالتے ہی سدھیر مسکرایا۔ کیوں کہ ماتھر نے لکھا تھا "یار تم کتنے خوش قسمت ہو۔ بملا جیسی بیوی پائی ہے۔ بھئیا ہمیں دعائیں دو کہ اس دن ہیک مینز میں تمھاری ملاقات اس سے کرائی۔ مگر اس دنیا میں کون کسی کا احسان مانتا ہے۔"

"سُنا تم نے ماتھر نے کیا لکھا ہے؟"

"جی!"

سدھیر نے بملا کے بارے میں جو جملے ماتھر نے لکھے تھے۔ وہ پڑھ کر سنائے

اور پھر دوسرے خطوں کو کھول کر پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ اور اس نے یہ نہیں دیکھا کہ ماتھر کے دوستانہ مذاق کو سن کر ببلا کی آنکھوں میں کوئی چمک پیدا نہیں ہوئی۔ صرف ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ کا خم پیدا ہوا اور پھر یکایک غائب ہو گیا۔

دوسرا خط جو سدھیر نے کھولا۔ وہ کلب کا بل تھا۔ وہ اس نے ببلا کی طرف بڑھا دیا۔ کیوں کہ بلوں کی ادائگی وہی کرتی تھی۔ تیسرا خط آئی۔ سی۔ ایس ایسوسی ایشن کی طرف سے آیا تھا۔ سالانہ جلسے اور انتخابات کے بارے میں۔

"سنا ببلا تم نے۔ اس سال بلدیو اور احسان وغیرہ سکریٹری کے لئے میرا نام پرپوز کرنا چاہتے ہیں؟"

"جی"

چوتھا خط۔ مگر یہ اس کے نام نہیں ببلا کے نام تھا۔ ایک موٹا گرد میلا سا پرانا لفافہ جس پر کتنی ہی مہریں لگی ہوئی تھیں اور کئی بار پتے میں کاٹ چھانٹ کی ہوئی تھی۔ اور یہ کیا ہے؟ مس ببلا نیر جی! یہ کون بد تمیز ہے۔ جو مسز ببلا سکسینہ کو شادی کے بارہ برس بعد بھی مس لکھتا ہے؟......

سدھیر نے ایک نظر ببلا کی طرف دیکھا۔ جو اس وقت نوکر کو دوپہر کے کھانے کے بارے میں ہدایات دینے میں مصروف تھی۔ یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ ببلا نے اپنا خط نہیں پہچانا۔ سدھیر نے چاقو سے [illegible] لفافہ چاک کیا۔ شادی کے بعد کئی برس تک اس نے ببلا کے نام آئے ہوئے کتنے ہی خط چپکے چپکے کھول کر پڑھے تھے۔ مگر وہ اس کے کالج کی سہیلیوں

رشتے کی بہنوں وغیرہ کے کوئی "مشتبہ" خط نہ ملا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں اس خط کے لفافے ہی سے معلوم ہوتا تھا کہ اس میں کوئی پرانا بھید ضرور ہے۔ شاید آج اسے معلوم ہو سکے کہ اس "جی" کی اُکتاہٹ اور بے دلی کے پیچھے کون سا راز چھپا ہوا ہے!

لفافے میں سے کئی ورقوں کا طویل خط نکلا۔ مگر اس کی پہلی چند سطریں ہی سدھیر کے سکون کو ہمیشہ کے لئے پاش پاش کرنے کو کافی تھیں لکھا تھا...

"جان سے زیادہ پیاری بملا۔

تم سے ملے دو مہینے ہو چکے ہیں۔ اور میرے لئے یہ دو مہینے دو برس سے بھی زیادہ طویل ہیں۔ کیا ہم ہمیشہ اسی طرح چھپ چھپ کر ہی مل سکیں گے؟ یہ دیوار جو ہمارے درمیان کھڑی ہے۔ کیا یہ کبھی ڈھائی نہ جا سکے گی؟......"

غصے اور نفرت کے جوش سے سدھیر کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس سے آگے اس سے یہ خط پڑھا نہ جا سکا... یہ خط جو اس کی بیوی کی آوارگی اور بدچلنی کا اعلان نامہ تھا۔ جلدی جلدی ورق اُلٹ کر اس نے آخری صفحے پر نظر ڈالی۔ خط کے اختتام پر لکھا تھا: "ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمھارا انیل"

"انیل!" اس کے دماغ میں یہ انجانا نام بم کے گولے کی طرح پھٹا۔

"بملا!" وہ چلّایا اور بملا جو اس وقت کمرے کے باہر جانے والی تھی۔ ٹھٹک کر دروازے کے پاس رک گئی۔

"جی!"

جی! جی! جی! وہی ملائم، ٹھنڈا، پھیکا "جی" اور اس وقت سدھیر کو

ایسا لگا۔ جیسے یہ دو حرفی لفظ ایک طعنہ ہو۔ ایک گندی گالی ہو۔ ایک طمانچہ ہو جو اس کی بیوی نے اس کے مُنہ پر دے مارا ہو........

"ادھر آؤ" وہ پھر چلاّیا۔ اور وہ خاموشی سے میز کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ اور اس کے خاموش چہرے پر حیرت پکار پکار کہہ رہی تھی ——"جی؟"

"انیل کون ہے؟"

سدھیر نے یہ سوال اتنا اچانک کیا کہ چند لمحوں تک بملا بھونچکی کھڑی رہی۔ جیسے سمجھی ہی نہ ہو کہ اس سے کیا پوچھا گیا ہے........ یا یقین نہ آتا ہو کہ یکایک اس کے شوہر کو یہ بھید کیسے معلوم ہو گیا...... مگر پھر جیسے دھیرے دھیرے سورج پر سے بادل ہٹ جاتے ہیں۔ اور برسات کی نم آلود دھوپ زمین پر پھیل جاتی ہے۔ اسی طرح ایک دھیمی، میٹھی نرم مسکراہٹ اس کے چہرے پر کھل گئی۔

"انیل؟" اس نے بڑی ملائمت سے نام دُہرایا..... جیسے ماں بچّے کا نام لیتی ہے۔ جیسے تپسوی بھگوان کا نام لیتا ہے۔ جیسے شاعر اپنا محبوب شعر گنگناتا ہے........ اور اس کی آنکھیں ایک نئی روشنی سے چمک اٹھیں..

...... وہ روشنی جو بارہ برس تک سدھیر نے کبھی اپنی بیوی کی آنکھوں میں نہیں دیکھی تھی........

"ہاں۔ ہاں۔ انیل۔ کون ہے وہ؟" بملا کی آنکھوں میں اس نئی روشنی کو دیکھ کر سدھیر آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

مگر بملا کسی دوسری ہی دنیا میں تھی۔ اس کی آنکھیں دور — بہت دور —

نہ جانے کیا دیکھ رہی تھیں۔ کوئی بہت خوب صورت منظر؟ کوئی دِلکش یاد؟ امید کی کوئی کرن؟

"وہ سب کچھ ہے"......... اس کے مسکراتے ہونٹوں نے سدھیر سے نہیں بلکہ خود سے سرگوشی کی......... پھر ان ہونٹوں کی مسکراہٹ بجھ گئی۔ اور ان کے خم میں ایک کڑوا طنز ابھر آیا: "اور اب وہ کچھ بھی نہیں ہے......" پھر کسی نامعلوم غم کے بوجھ سے اس کی گردن جھک گئی۔

"پہیلیاں مت بوجھواؤ" سدھیر چلّایا۔ اس کا جی چاہتا تھا۔ کہ میز کو اُلٹ دے، تمام چینی کے برتنوں کو چکنا چور کر دے۔ چائے دان کو اُٹھا کر بملا کے سر پر دے مارے: "سچ سچ بتاؤ۔ کیا تم اس سے محبت کرتی ہو؟"

جھکی ہوئی گردن پھر اُٹھ گئی۔ آنکھوں کے ڈبڈباتے ہوئے آنسوؤں میں سے پھر وہ عجیب روشنی جھلکنے لگی۔ پھیکے اور بے رنگ انداز میں صرف "جی" کہنے والی بملا نے فخریہ انداز سے سر اٹھا کر، سدھیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "جی ہاں۔ آپ کا خیال صحیح ہے"

اور اس لمحے سدھیر کی دنیا تہ و بالا ہو گئی۔ اسے ایسا لگا کہ بملا نے اس کی عزت پر، اس کی آئی۔ سی۔ ایس کی شان پر، اس کی مردانگی پر ہمیشہ کے لئے کالک پوت دی ہے۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ بملا نے اسے ایک ایسی غلیظ گالی دی ہے۔ جو عمر بھر اس کے کانوں میں گونجتی رہے گی۔ اس وقت تعلیم اور تمدن، تہذیب اور اخلاق کے سب چھلکے اس پر سے اُتر گئے۔ اب وہ لندن کا پڑھا ہوا بیرسٹر نہیں تھا۔ آئی۔ سی۔ ایس ایسوسی ایشن کا ہونے والا

سکریٹری نہیں تھا۔ کلب کا ممتاز ممبر نہیں تھا۔ نرائن گنج ضلع کا ڈپٹی کمشنر نہیں تھا۔ جس کی مٹھی میں ایک لاکھ سے زائد انسانوں کی قسمت تھی۔ اس وقت وہ صرف ایک ننگا وحشی تھا۔ غصّے کے جوش میں بھرا ہوا ایک مرد، جس کی عورت نے اسے دھوکا دیا تھا۔

وحشی چلّایا: "نکل جاؤ اس گھر سے۔ اسی وقت۔ اسی دم!"

بملا کے چہرے پر نہ غصّے کے آثار پیدا ہوئے نہ غم کے۔ وہ اب بھی کسی دوسرے ہی دنیا میں تھی۔ اس نے سدھیر کی چیخ کو ایسے سُنا جیسے بہت دور سے کوئی دھیمی سی آواز آئی ہو...... اور ایک بار پھر اس کے ہونٹ ایک معصوم سی مسکراہٹ سے کھل گئے...... جیسے کھوئے مسافر کو بڑی تلاش کے بعد راستہ مل جائے۔ جیسے وہ مدّت سے... بارہ برس سے... اسی گھڑی کا انتظار کر رہی تھی۔ اور آخر کار وہ مبارک ساعت آن ہی پہنچی ہو۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف ایک نظر اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ اس نظر میں شکایت نہیں تھی۔ شکوہ نہیں تھا۔ رحم تھا۔ معافی تھی۔ جیسے اس کی نگاہیں کہہ رہی ہوں "اس میں تمہارا قصور نہیں۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھو گے۔" پھر وہ اپنے بیڈ روم میں گئی۔ اور وہاں سے اپنی چھوٹی بچی کو گود میں لے کر، برآمدے میں سے ہوتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس کے قدموں کی آواز دور ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ باہر سڑک کے شور میں ہمیشہ کے لئے کھو گئی۔

سدھیر کا خیال تھا کہ وہ روئے گی۔ گڑگڑائے گی۔ اپنی صفائی پیش کرے گی۔ اپنے گناہ کی معافی مانگے گی۔ آئندہ اپنے اعمال کو درست کرنے کا وعدہ کرے گی ...... مگر وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا کہ بملا بیچ مچ گھر چھوڑ کر چلی جائے گی۔ اس خاموش طمانچے سے اس کی ساری ہستی جھنجھنا اٹھی ہتھوڑے کی طرح اس کے دماغ پر ایک ہی چوٹ پڑتی رہی: "انیل! انیل!! انیل!!!" یہ انیل کون ہے؟ میں اس کا پتہ لگا کر چھوڑوں گا۔ اس پر ایک بیاہتا عورت کو اغوا کرنے کا دعوے کروں گا۔ اسے جیل بھجواؤں۔ اسے جان سے ماردوں گا ...."

.... اسے جیل بھجواؤں گا۔ اسے جان سے ماردوں گا۔

پاگلوں کی طرح دوڑتا ہوا وہ بملا کے کمرے میں پہنچا۔ اسے معلوم تھا کہ اپنی وارڈروب کے ایک خانے میں بملا اپنے خط وغیرہ رکھتی ہے۔ چابیوں کا گچھا سامنے پلنگ پر پڑا تھا۔ جاتے جاتے وہ پھینک گئی تھی۔ سدھیر نے وارڈروب کھولی۔ خانے کو چابی لگا کر باہر کھینچا۔ اس میں رکھے ہوئے خطوں کے پلندوں اور کاغذات کو ٹٹولا۔ سب سے نیچے کی تہہ میں سُرخ ریشمی فیتے سے بندھے ہوئے چند خط رکھے تھے۔ ضرور یہ انیل کے خط ہوں گے۔

اس کا خیال صحیح نکلا۔ ہر خط میں اعلانِ محبت "بملا میری جان!" "میری اپنی بملا!" "تمہارا اور صرف تمہارا انیل"، "اس دنیا میں اور اگلی دنیا میں تمہارا تمہارا تمہارا ......" ہر فقرہ ایک زہر آلود نشتر کی طرح اس کے دل میں کچوکے لگاتا رہا۔ ایک ایک کر کے وہ خط فرش پر گرتے رہے۔ مگر یہ

کیا؟........ خطوں کے بیچ میں تہہ کیا ہوا اخبار کا ایک تراشہ........
کھولنے پر دیکھا کہ ایک نوجوان کی تصویر —— گہری، چمکتی ہوئی آنکھیں! اونچا ماتھا۔ مسکراتے ہوئے ہونٹ —— اس کے نیچے یہ خبر چھپی ہوئی تھی :۔

نوجوان شاعر کی موت

ہمیں یہ اطلاع دیتے ہوئے دلی صدمہ ہے کہ لکھنؤ کے نوجوان ترقی پسند ادیب اور انقلابی شاعر انیل کمار انیؔل کا انتقال ہو گیا ہے۔ ۲۹ء کی ستیہ گرہ تحریک میں وہ جیل گئے تھے اور وہیں انھیں دق کا منحوس عارضہ ہو گیا تھا........

سدھیر ساری خبر نہ پڑھ سکا۔ اس لئے کہ تراشے پر اخبار کی اشاعت کی تاریخ دی ہوئی تھی۔ ۱۰ر جون ۱۹۴۰ء۔ اس کے ہاتھ سے باقی خط اور تراشہ فرش پر گر پڑے۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ ماجرا کیا ہے۔ انیل!! انیل!! انیل!! کیا کوئی مر کر بھی زندہ ہو سکتا ہے؟

کھوئے مسافر، ہارے ہوئے جواری کی طرح وہ کھانے کے کمرے میں واپس آیا۔ میز پر انیل کا خط اور لفافہ پڑے ہوئے تھے۔ اس نے لفافہ اٹھا کر ایک بار پھر غور سے دیکھا۔ درجنوں گول مہروں کے درمیان میں ایک چوکور مہر لگی ہوئی تھی جس پر انگریزی کے تین حرف چھپے ہوئے تھے......
D. L. O. ڈی۔ ایل۔ او۔ ڈیڈ لیٹر آفس۔

الف لیلہ ۱۹۵۶

یعنی

پتھر کی سیج پر ایک ہزار راتیں

"بیٹا پہلی رات ہی ہمیشہ سب سے کٹھن ہوتی ہے۔"
بوڑھے بھکاری کے یہ الفاظ مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ جس اناڑی پن سے میں فٹ پاتھ پر اخبار کے کاغذ بچھا کر سونے کی تیاری کر رہا تھا! سی سے وہ پہچان گیا تھا کہ میں اُس کی دنیا میں نووارد ہوں۔ اور ایک خشک سی ہنسی ہنستے ہوئے اُس نے کہا۔ "گھبراؤ نہیں بیٹا۔ بہت جلد اس پتھر کی سیج پر سونے کی عادت پڑ جائے گی۔"

اپنی نئی زندگی کی پہلی رات گزارنے کے لئے میں نے جان بوجھ کر ایک سنسان سی گلی کا اندھیرا سا فٹ پاتھ تلاش کیا تھا۔ ہر لمحہ یہ ڈر لگا ہوا تھا کہ کوئی جاننے والا نہ مل جائے۔

ان تین برسوں میں اُس خودداری اور شرم کے احساس کو میں کتنی دور چھوڑ آیا ہوں۔ در اصل یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسی رات کو میری موت واقع ہوئی۔

پرانا" میں" مر گیا۔ اور فٹ پاتھ پر رہنے والوں کی گمنام برادری میں ایک خانہ بدوش کا اور اضافہ ہوا۔

فٹ پاتھ سے پہلے

مجھے اُس وقت بمبئی آئے صرف ایک مہینہ ہوا تھا۔ لیکن اُن تیس دنوں میں میری کایا ہی پلٹ گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ نوجوان جو بوری بندر کے اسٹیشن پر اُترا تھا۔ اب ساٹھ برس کا بوڑھا ہو چکا ہے۔ نہ جانے میری آنکھوں کی چمک میرے گالوں کی سُرخی، میرے بدن کی طاقت اُن تیس دنوں میں کہاں غائب ہو گئی تھی۔

میں بانفرس سے بمبئی تھرڈ کلاس میں آیا تھا۔ مگر بلا ٹکٹ نہیں۔ ٹکٹ کے علاوہ میری جیب میں بائیس روپے تھے، میٹریکولیشن کا سرٹیفکیٹ تھا۔ اور ایک پُرانی مگر کام کرتی ہوئی گھڑی تھی جو مجھے اپنے سورگ باشی پتا سے ورثے میں ملی تھی۔ اور میرے دل میں جوانی کا جوش تھا۔ کام کرنے اور ترقی کرنے کی امنگ تھی۔

میرے ایک دوست نے اپنے چچیرے بھائی کے نام ایک چٹھی دی تھی کہ جب تک مجھے کام اور کوئی رہنے کی الگ جگہ نہ مل جائے وہ اپنے ہاں مجھے رکھ لے۔ وہ بے چارہ ایک کپڑے کے کارخانے میں کام کرتا تھا اور اپنی بیوی اور دو بچوں سمیت پریل کی ایک چال میں پانچویں مالے پر ایک کوٹھڑی میں رہتا تھا جو بمبئی کی زبان میں "کھولی" کہلاتی ہے۔ یہ کوٹھڑی یا کھولی رہنے کے

علاوہ نہانے دھونے اور کھانے پکانے کے لیے بھی استعمال ہوتی تھی۔ کھولیوں
کی قطار کے پیچھے ایک پتلا سا برآمدہ تھا۔ جس میں سے ہو کر مشترکہ پاخانوں کو
راستہ جاتا تھا۔ رات کو میں اس برآمدے میں چٹائی بچھا کر سو رہتا۔ قریب ہی
ایک کارخانے کی چمنی تھی جس کا دھواں اکثر ہوا کے ساتھ اڑتا ہوا وہاں تک
آجاتا۔ اس کے علاوہ پاخانوں کے نل بھی کام نہ کرتے تھے۔ اور رات بھر ایسا
لگتا تھا جیسے اصغر علی محمد علی تاجر عطر کے کارخانے سے خوشبوؤں کے بھبکے
آرہے ہیں۔ لیکن دن بھر کام تلاش کرنے کے بعد جب میں گھر لوٹتا تو اتنا
تھکا ہوا ہوتا کہ بستر پر پہنچتے ہی سو جاتا۔ نہ فیکٹری کا دھواں مجھے ستاتا نہ پاخانوں
کی بدبو اور نہ ان تمام لوگوں کے خراٹے جو میری طرح اسی برآمدے
میں سوتے تھے۔ اور میں اپنے دوست کے بھائی کا شکرگزار تھا کہ اس کی
مہربانی سے میرے پاس سر چھپانے کا ایک ٹھکانہ تو ہے۔ گھر سے خط منگانے
کا ایک پتہ تو ہے۔

اور پھر ایک رات کو جب ہوا بند تھی اور برآمدے میں بھی ہم لوگ ہاتھ
کے پنکھے جھلنے پر مجبور تھے کھولی کے بند دروازے کے پیچھے سے مجھے کچھ کھسر
پھسر سنائی دی۔

"باپ رے کیا گرمی ہے!" بیوی کہہ رہی تھی۔ "بھگوان کے لئے دروازہ
تو کھول دو۔ شاید ہوا کی کوئی رمق آجائے۔" "پاگل ہوئی ہے!" اس کے
میاں نے جواب دیا۔ "دروازہ کیسے کھول سکتے ہیں جب "وہ" وہاں سو رہا
ہے۔ یہ تو بڑی بے شرمی ہوگی۔"

سو اگلے دن "وہ" یعنی میں نے اُن سے کہا کہ میں نے دوسری جگہ سونے کا انتظام کر لیا ہے۔

"سوچ لو بھائی۔ نہ جانے وہاں تمہیں آرام بھی ملے گا؟" اُس شریف آدمی نے تکلف کرتے ہوئے، مجھ سے کہا۔

اور میں نے صفائی سے جھوٹ بولا "فکر نہ کرو۔ وہاں جگہ بہت ہے۔"

یہ میں نے نہیں کہا کہ اتنی بڑی جگہ ہے، جتنا بمبئی شہر۔

پہلی رات

"بے در و دیوار کا اِک گھر بنانا چاہیئے"

"بیٹا یہ پہلی رات ہی سب سے زیادہ کٹھن ہوتی ہے۔"

بھکاری کا کہنا کتنا صحیح تھا۔ اُس رات کو مشکل سے چند منٹ میں سو سکا ہوں گا۔ فٹ پاتھ کے پتھروں کی ہزاروں نوکیں میرے بدن میں چبھ رہی تھیں۔ قریب کی نالی میں سے دنیا کی بدترین بدبوؤں کے جھونکے آ رہے تھے۔ مجھے نووارد سمجھ کر ایک خارش زدہ کتا میرا معائنہ کرنے پر تلا ہوا تھا۔ ایک مریل سی بلی میری ٹانگوں میں اُلجھی ہوئی ایک چوہے کا پیچھا کر رہی تھی اور چند لمحے پہلے یہی چوہا میرے پاؤں کی اُنگلیوں کو کترنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ پیروں کی حفاظت کے لئے بہتر ہے کہ جوتے پہن کر سوؤں۔ اندھیرے میں ٹٹولا تو معلوم ہوا کہ جوتے غائب ہیں۔ میں نے طے کیا کہ آئندہ سوتے ہوئے کبھی جوتا نہیں اُتاروں گا۔

جب آنکھ نہ لگی تو میں نے بیڑی سلگائی اور آسمان کی طرف دیکھتا رہا ــــــ ستارے اس فٹ پاتھ سے دور، بہت دور تھے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یہ خوف ہوا کہ آس پاس کی اونچی اونچی عمارتیں جھک کر مجھے دیکھ رہی ہیں اور نہ جانے کب اڑا اڑا دھم کر کے گر پڑیں اور ہم فٹ پاتھ پر سونے والوں کو چکنا چور کر دیں۔

اسکول میں پڑھا ہوا غالبؔ کا ایک مصرع یاد آیا "بے درودیوار کا اِک گھر بنانا چاہیے"۔ بہت کوشش کی کہ دوسرا مصرع یاد آجائے مگر یاد نہ آیا۔ اس لیے دیر تک یہی گنگناتا رہا "بے درودیوار کا اِک گھر بنانا چاہیے"

میں نے سوچا کہ شاید غالبؔ بھی فٹ پاتھ پر رہنا چاہتا تھا۔ کیوں کہ یہ بھی تو بے درودیوار کا گھر ہے۔ پھر سوچا اگر غالبؔ کو سچ مچ فٹ پاتھ پر سونا پڑتا تو کیسے شعر کہتا۔ اور پھر ایک فلمی گیت کا ٹکڑا نہ جانے کہاں سے تیرتا ہوا دماغ میں آگیا "بستر بچھا دیا ہے ترے در کے سامنے" کچھ دیر اسے گنگناتا رہا۔ پھر میں نے پتھریلے فرش پر پہلو بدلتے ہوئے سوچا۔ شعر کہنا آسان ہے اور فٹ پاتھ پر سونا مشکل ہے۔

اڑتالیسویں رات

چاندی کی لمبی سڑک

اب میں فٹ پاتھ کے پرانے رہنے والوں میں شمار کیا جاتا ہوں۔

اس پہلی رات کے بعد کی راتوں میں میں نے ایک مناسب "بیڈ روم" کی

تلاش میں گزاریں کبھی مالا بار ہل پر ہینگنگ گارڈن کی ایک بنچ پر سویا، کبھی چوپاٹی کی نرم ریت پر سمندر کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں، کبھی میرین ڈرائیو پر ایک مشہور فلم اسٹار کی فلیٹ کے عین سامنے۔ اتنے قریب کہ کبھی کبھی کھڑکی کے شیشوں پر اُس کا سایہ کپڑے بدلتے ہوئے نظر آتا اور میری نیند اُچاٹ کر جاتا۔ لیکن کہیں بھی میں دو چار راتوں سے زیادہ نہ گزار سکا۔ ہر جگہ سے پولیس والوں نے مجھے ہنکا دیا، جیسے اُن ڈھور ڈنگروں کو ہنکا دیا جاتا ہے جو پکی ہوئی کھیتی میں گھس آتے ہیں۔ اور ہر بار میں سوچتا: "ارے بھائیو۔ میں محل نہیں مانگتا۔ بنگلہ نہیں مانگتا، گدّے دار پلنگ۔ کوچ۔ قالین۔ مسہری، جھاڑ فانوس، میز کرسی نہیں مانگتا۔ کم سے کم مجھے آسمان تلے کسی صاف ستھری ہوادار جگہ پر تو سونے دو۔" مگر اب مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ جیسے غریب غربا امیروں کے گھروں میں نہیں رہ سکتے اسی طرح وہ امیروں کے ٹہلنے کی تفریح گاہوں یا اُن کے گھروں کے سامنے فٹ پاتھ پر بھی نہیں سو سکتے۔

سو اب میں فیروز شاہ مہتا روڈ پر مقیم ہوں۔ عین ایک بنک کے سامنے سوتا ہوں۔ نہ جانے کیوں مگر یہاں سو کر مجھے بڑا اطمینان محسوس ہوتا ہے۔ جیسے یہ بنک دراصل خود میری ملکیت ہو۔ اور میں وہاں اپنے روپے کی حفاظت کے لئے سو رہا ہوں۔

سوتے وقت میں ہمیشہ اپنا مُنہ بنک کی شیشے والی دیواروں کی طرف رکھتا ہوں۔ یہاں بڑے بڑے سنہری حروف میں لکھا ہے: "اس بنک کا سرمایہ ہے .... ۵" اب مجھے اپنی پتھر کی سیج پر سونے کی عادت پڑ چکی

ہے لیکن آنکھ بند کرنے سے پہلے میں کافی دیر تک ان سات سُنہری صفروں کو تکتا رہتا ہوں ـــــ ....۵ روپے ـــــ یعنی پانچ کروڑ ـــــ یا پچاس کروڑ ؟ ـــــ حساب میں میں ہمیشہ سے کمزور ہوں۔

کل رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے پاس چاندی کے روپوں کا ڈھیر ہے ـــــ لاکھوں کروڑوں روپے ـــــ اور میں ان کو سڑک پر برابر رکھتا چلا جا رہا ہوں۔ یہاں تک کہ چاندی کی یہ زنجیر بمبئی سے لے کر ہاتھرس تک جا پہنچی ہے ـــــ ہاتھرس .... جہاں میری ماتا جی اس امید میں دن بتا رہی ہیں کہ ایک دن اُن کا سپوت بمبئی سے لاکھوں روپے کما کر لوٹے گا......

ایک سو ستائیسویں رات

میرا پتہ: تاج محل ہوٹل

جس رات بنک میں ڈاکہ پڑا مجھے وہ جگہ چھوڑنی پڑی۔ اُس رات کے واقعات اب تک میری یاد میں اس طرح گھومتے ہیں جیسے سینما کے پردے پر کوئی ڈرامہ۔ بنک میں آپ سے آپ بجنے والی بجلی کی گھنٹی لگی ہوئی تھی۔ صبح کے تین بجے ہوں گے کہ یہ گھنٹی دفعتاً بجنے لگی۔ اور آس پاس کے سب فٹ پاتھ پر سونے والے ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھے۔ آنکھیں ملتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ڈاکو بنک کی کھڑکی میں سے کود رہے ہیں۔ ان پر مجھے بہت غصہ آیا، کیوں کہ آخر وہ میرا ہی تو بنک تھا جس میں انھوں نے ڈاکہ ڈالا تھا! وہ میرا ہی

روپیہ تو وہ لے کر بھاگ رہے تھے ......

سو میں نے ایک ڈاکو کو پتلون کے پائینچے سے پکڑ لیا۔ اُس کے ہاتھوں میں نوٹوں کے بنڈل تھے۔ سو وہ انھیں چھوڑے بغیر مجھ پر حملہ نہیں کر سکتا تھا میں نے سوچا کیا پکڑا ہے بدمعاش کو۔ اب بھاگ کر کہاں جاتا ہے؟ ......

مگر جب پولیس کی سیٹیوں کی آواز قریب آتی ہوئی سُنائی دی تو اُس نے بڑے زور سے مجھے لات ماری مگر میں نے تب بھی پتلون کا پائینچہ نہ چھوڑا۔ میں دھڑام سے فٹ پاتھ پر گر گیا اور میرے سر میں اتنے زور سے پتھر لگا کہ تارے نظر آنے لگے۔ اور جب میرے ہوش حواس ٹھکانے آئے تو میں نے دیکھا کہ ڈاکو کی پتلون تو میرے ہاتھوں میں ہے اور خود ڈاکو سڑک پر بھاگا چلا جا رہا ہے۔ ادھ ننگا...... بے شرم کہیں کا۔

ڈاکو کی پتلون اچھے قیمتی کپڑے کی تھی۔ پہلے تو میں نے سوچا اُسے گول کر جاؤں۔ مگر پھر میں نے آزاد ہندوستان کے ایک معزز شہری کی حیثیت سے اپنے فرض کا احساس کیا اور اُس پتلون کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ کیوں کہ میرا خیال تھا کہ اس نشانی سے سرکاری جاسوس فوراً ڈاکوؤں کا پتہ لگا سکیں گے اور میرے بنک کا لٹا ہوا روپیہ واپس مل جائے گا۔ لیکن تھانے میں جب انھوں نے میرا پتہ پوچھا اور میں نے جواب دیا: "بنک کے سامنے والا فٹ پاتھ" تو ان کی نظریں ہی بدل گئیں۔ اور وہ لگے مجھ سے سوال جواب کرنے۔ جیسے میں معزز اور فرض شناس شہری نہیں کوئی چور ڈاکو ہوں۔ اُس کے بعد میں نے طے کر لیا کہ بنک کے قریب سونا خطرناک ہے۔ اُس سے دور ہی رہنا چاہیے۔

جیسے کہ وہ بنک میرا نہیں کسی اور کا ہے!

اور اگلے دن سے میں تاج محل ہوٹل میں اُٹھ آیا۔ میرا مطلب ہے تاج محل ہوٹل کے باہر والے برآمدے سے جہاں اس ہوٹل کے میرے جیسے غیر سرکاری مہمان قیام کرتے ہیں۔ اس جگہ میں کئی سہولتیں ہیں۔ ایک تو سمندر کے کنارے ہے اس لیے رات کو اکثر ٹھنڈی ہوا آیا کرتی ہے۔ دوسرے جہاں سوتا ہوں وہاں سے کچن قریب ہے۔ اور کھانوں کی اتنی اچھی اچھی خوشبوئیں آتی ہیں کہ خواب میں ہمیشہ مرغ مسلّم اور کٹلسوں کے پہاڑ نظر آتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ رات کو دیر سے آنے اور جانے والے مہمانوں کا جلوہ مفت میں ہوتا ہے۔ کالے موٹوں میں ولایتی صاحب لوگ۔ پتلے ریشمی فراک پہنے میمیں۔ کھادی پہنے لیڈر مہاشے اور باریک شفون کی ساڑھیاں اور ولایتی سینٹ لگائے اُن کی شریمتیاں۔ ہیرے جواہرات سے لدی ہوئی رانیاں مہارانیاں۔ بڑی بڑی خوبصورت موٹر کاریں "ٹا ٹا ..... مائی ڈیر" ...... "بائی بائی ڈارلنگ ..."

دولت اور حسن اور فیشن کا یہ تماشا سینما سے بھی زیادہ دلچسپ اور مزیدار ہے۔ اور پھر بالکل مفت۔ بلا ٹکٹ۔ سینما میں تو چلتی پھرتی پرچھائیاں ہوتی ہیں۔ مگر یہ میمیں، یہ مسیں، یہ رانیاں، یہ بیگمیں، یہ دیویاں اور کماریاں اور شریمتیاں۔ یہ حسین عورتیں جو تاج محل ہوٹل میں ڈنر کھانے اور ڈانس کرنے آتی ہیں یہ سب تو اصل ہیں اصل۔ فٹ پاتھ پر لیٹے لیٹے اُن کے عطر اور سینٹ کی خوشبوئیں سونگھی جا سکتی ہیں۔ کبھی کبھی جب کوئی جارجٹ کی ساڑھی یا پاؤں تک کا فراک قریب سے گزرتا تو اُس کی نرم لمس محسوس کی جا سکتی ہے۔ گوری گوری پنڈلیاں نظر آتی

ہیں میرے قریب ہی جو نوجوان سوتا ہے وہ فلموں میں اکسٹرا کا کام کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر ہم آدمی نہ ہوتے سینما کیمرہ ہوتے اور جو کچھ ہم لیٹے لیٹے کن انکھیوں سے دیکھتے ہیں وہ سب فلم کر لیا جاتا تو سنسر والے اُس سین کو کبھی پاس نہ کرتے!

اور ڈائیلاگ تو ایسے ایسے سنائی دیتے ہیں کہ کیا کبھی کسی فلم میں سُنے ہوں گے۔ کہتے ہیں کہ شراب بندی کے اِس دور میں بھی بڑے بڑے ہوٹلوں میں ایک "پرمٹ روم" ہوتا ہے جہاں بڑے آدمی سرکاری لائسنس لے کر شراب پیتے ہیں۔ شاید اسی لیئے آدھی رات کے بعد جو لوگ ہوٹل سے نکلتے ہیں وہ بڑی رنگین اور مزیدار باتیں کرتے ہوتے ہیں۔ بے جھجک اور بڑی بے تکلفی سے۔ زمین پر پڑی ہوئی مخلوق سے بالکل بے پروا، جیسے ہم مُردے ہوں۔ یا بے زبان بے عقل جانور ہوں۔ یا شاید وہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ تو سو رہے ہیں۔ اور جاگ بھی رہے ہیں تو فٹ پاتھ پر بسنے والے انگریزی کی گفتگو کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ (اور اُن کو میرے میٹریکولیشن سارٹیفکیٹ کا علم ہی نہیں ہے۔ نہ انھیں معلوم ہے کہ میرے قریب سونے والا راجو۔ جو اپنے آپ کو محکمۂ بیکاری کا انسپکٹر کہتا ہے پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے پاس ہے) سب کے سب ہماری ہستی کو قطعاً فراموش کر کے بات کرتے ہیں۔

"چلو ڈارلنگ"____

"رات کو اس وقت، کہاں؟"

"چلو جوہو چلیں..... کیا خوب صورت چاندنی رات ہے۔"

اور ان کے قہقہوں میں موٹریں سٹارٹ ہونے کی آواز شامل ہو جاتی ہے۔ اور کاریں روانہ ہو جاتی ہیں۔ اپالو بندر پر سناٹا سا چھا جاتا ہے۔ صرف سمندر کی لہریں پتھّر کی دیوار سے ٹکرا کر فریاد کرتی رہتی ہیں۔ اور میری نیند مجھ سے آنکھ چرا کر اُن کاروں کے ساتھ اُڑتی ہوئی جو ہو کے ساحل پر جاتی ہے اور چاندنی رات میں چمکتی ہوئی ریت پر نہ جانے کس کی تلاش میں گھومتی رہتی ہے۔ ۔ ۔ ۔

دوسو چھہتّرویں رات

"ارے واہ یار۔ دلیپ کمار"

تاج محل ہوٹل چھوڑے مجھے کافی دن ہو چکے ہیں۔ دراصل وہ جگہ میں نے اپنی مرضی سے نہیں چھوڑی بلکہ مجبوری سے۔ ہوا یہ کہ ایک لنگڑا خارش زدہ بھکاری بھی وہاں ہم لوگوں کے قریب سونے لگا تھا۔ اور ایک رات اس نے ہوٹل سے باہر نکلتی ہوئی ایک میم صاحب سے بھیک مانگتے ہوئے اُس کے سفید فراک کو اپنے گندے ہاتھ سے چھو لیا۔ میم صاحب نے اُس کو تو انگریزی میں گالی دے کر جھڑک دیا، پھر شاید منیجر سے رپورٹ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اگلی رات کو جب ہم اپنے اپنے بستر بچھانے وہاں پہنچے تو ہمیں پولیس کی مدد سے برآمدے کے باہر نکال دیا گیا۔

جب سے میں موسم کے مطابق کئی مکان بدل چکا ہوں۔ برسات سے پہلے کے گرمی کے مہینے تو میں نے اپالو بندر پر گزارے۔ جب بارشیں شروع

ہو گئیں تو میں نے مہاتما گاندھی روڈ پر ایک بڑی دوکان کے چوڑے برآمدے میں پناہ لی۔ یہ جگہ بارش سے کسی قدر محفوظ تھی۔ مگر اُس دوکان کی شیشے کی کھڑکیوں میں پلاسٹر کی قدِ آدم نیم برہنہ لڑکیاں جو تیرے کالباس پہنے کھڑی تھیں۔ وہ رات بھر مجھے گھورتی رہتی تھیں۔

اب میں بے کار نہیں ہوں۔ ایک دفتر میں ۴۵ روپے ماہوار پر چپراسی کی نوکری مل گئی ہے۔ یہ دفتر "امپورٹ اِکسپورٹ" کا ہے۔ یعنی اِدھر کا مال اُدھر اور اُدھر کا مال اِدھر۔ مگر میں تو کبھی نہ کوئی مال سامان آتا جاتا دیکھتا ہوں نہ کوئی گاہک آتا ہے۔ البتہ تار دِن رات آتے ہیں، ٹیلی فون ہر وقت بجتا رہتا ہے کبھی ہندوستان کے کسی شہر سے تو کبھی کسی دوسرے ملک سے۔ کبھی سنگاپور، کبھی کولمبو، کبھی لندن کبھی نیویارک۔ مجھے تو یہ کوئی کالا بازار کا دھندا معلوم ہوتا ہے مگر جب تک اپنے ۴۵ روپے ہر مہینے کھرے ہیں، اپنے سے کیا مطلب اُس دفتر میں ہوتا کیا ہے۔

ہاں تو کام میرے پاس ہے مگر سر چھپانے یا سامان رکھنے کا اب تک کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی کھولی کے لیے لوگ دو دو سو روپے "پگڑی" مانگتے ہیں۔ اتنے روپے اکھٹے میرے پاس کہاں سے آتے ہیں۔ ہو سکتا تھا کہ میں شہر کے باہر مزدوروں کے جھونپڑوں کی بستیوں میں چلا جاتا۔ جو انھوں نے اپنے ہاتھوں سے خود تعمیر کی ہیں۔ مگر ایسی بستیاں شہر سے بہت دور ہیں۔ اور میں شہر کے ہنگامے میں رہنا چاہتا ہوں۔ ایک زمانہ تھا کہ قریب سے ایک ٹرام گزر جاتی، تو میری آنکھ کھل جاتی تھی۔ لیکن اب درجنوں ٹراموں اور

بسوں کے شور میں بھی میں آرام سے سوتا رہتا ہوں۔ کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ بلکہ اب شہر کی ہلچل، روشنی، دوڑ دھوپ اور چیخ پکار کے بغیر مجھے ایسا لگتا ہے کہ زندگی ادھوری ہے۔

یہ بھی ممکن تھا کہ میں چار پانچ آدمیوں کے ساتھ مل کر ایک کھولی لے لوں۔ ایسی حالت میں مجھے دس بارہ روپے ماہوار کرایہ دینا پڑتا۔ کسی دوست کی مہربانی سے رات بھر کے لئے میں ایسی کھولی میں سویا بھی۔ مگر وہاں اتنی گرمی تھی کہ رات بھر میں پسینے میں شرابور رہا۔ چھوٹی سی کوٹھڑی بغیر کھڑکیوں کی اور اس میں چھ سونے والے ـــــ اور سب کے ہاضمے خراب ـــــ سب خرّاٹے لینے والے ـــ اگلے دن ہی میں وہاں سے بھاگ آیا۔ اُس کوٹھڑی سے تو اپنا ہوادار فٹ پاتھ ہزار درجے بہتر ہے ......

سو اب میں لیمنگٹن روڈ پر آگیا ہوں۔ تاکہ جب جیب میں سینما دیکھنے کے پیسے نہ ہوں تو فٹ پاتھ پر سے ہی سینما گھروں کی رونق اور رنگینی اور ہلچل کا نظارہ کروں۔ اور جب کسی فلم کا پریمیر ہوتا ہے اُس رات تو بڑے بڑے فلم سٹاروں کا جلوہ ہوجاتا ہے کیسی بڑھیا بڑھیا موٹروں میں وہ سب آتے ہیں۔ واہ واہ۔ ایک دن تو بھیڑ بھڑکے میں میں دلیپ کمار کی موٹر کے اتنا قریب تھا کہ میں نے موٹر کی کھڑکی میں سر ڈال کر کہہ دیا " ارے واہ یار۔ دلیپ کمار ـــ ہاتھ تو ملاؤ "۔ مگر شور اور گڑبڑ کی وجہ سے شاید اُسی بے چارے نے ٹھیک سے سُنا نہیں اور اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے ہاتھ ملاتا پولیس والوں نے دھکے اور لاٹھیاں مار مار کر ہم لوگوں کو وہاں سے ہٹا دیا......

گر میرے خیال میں مجھے یہاں سے بھی کہیں اور جانا پڑے گا۔ یہ جگہ پولیس تھانے سے بہت ہی قریب ہے۔

پانچ سو چھتیسویں رات

جہاں ریلیں لوریاں سناتی ہیں۔

رات کو خاصی سردی پڑنے لگی ہے اور میں کھلا فٹ پاتھ چھوڑ کر دادر میں ایک ریل کے پل کے نیچے آباد ہو گیا ہوں۔ رات بھر ریلیں لوری سناتی ہوئی سر پر سے گزرتی رہتی ہیں۔ اُن کی دھڑ دھڑاہٹ سے ایسا لگتا ہے۔ جیسے سر کی مالش اور سارے بدن کی چپی ہو رہی ہو۔ اور پھر بالکل مفت۔

رات کو اوڑھنے کے لئے میں کینوس کا ایک پوسٹر اُٹھا لایا ہوں جس پر "رات کی رانی" فلم کی ہیروئن مس چنچل بالا کا جناتی سائز کا چہرہ بنا ہوا ہے۔ صرف ناک ہی ایک فٹ سے زیادہ لمبی ہے۔ اور ایک ایک آنکھ میرے جوتے کے برابر ہے۔ آدھی رات کے بعد جب ٹھنڈی ہوا چلتی ہے تو میں اس کینوس کی رنگین رضائی کو اوڑھ لیتا ہوں۔

پہلے تو میں نے شرافت برتی اور کینوس کو سیدھی طرف سے اوڑھتا رہا تاکہ تصویر والی سائڈ باہر رہے مگر آس پاس کے فٹ پاتھ پر رہنے والے لٹیرے سب کے سب آوارہ بدمعاش لوفر — آتے جاتے فقرے کستے، چنچل بالا کے حسین چہرے کو گھورتے اور ایک بدمذاق نے تو ان حسین ہونٹوں کے اوپر کوئلے سے ایک مونچھ بھی بنا دی۔ سو اُس دن سے میں کینوس کو اُلٹا کر کے

اوڑھنے لگا ہوں۔ اور رات بھر خواب میں ایک عجیب خوشبو مجھے پریشان کرتی رہتی ہے۔ اور سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کینوس اور آئل پینٹ کی بو ہے یا سن چنخیل بالا کے چہرے پر جو گلابی پاؤڈر لگا ہے اس کی خوشبو......

آٹھ سو چالیسویں رات

سُرخ پھول اور ایک سانولا میلا چہرہ

موسم بہار فٹ پاتھ کو بھی نظرانداز نہیں کرتا۔ گل مہر کے پیڑ پر پتہ ایک بھی نہیں لیکن اس کی سوکھی ٹہنیوں پر ہزاروں لال لال پھول کھل گئے۔ جب کبھی میں ان پھولوں کو دیکھتا ہوں تو میں سوچتا ہوں کہ ان میں کوئی گہرا فلسفیانہ اشارہ چھپا ہوا ہے۔ اگر میری بے رنگ زندگی اس سوکھی ٹہنیوں والے پیڑ کی طرح ہے تو یہ سرخ پھول ...... مگر بس ...... اس کے آگے میرا دماغ کام نہیں کرتا۔ اصل میں فٹ پاتھ پر رہنے والوں کو کوئی فلسفہ نہیں سوجھتا یہ اور بات ہے فلموں میں بھکاری بھی بات بات پر فلسفہ بگھارتے ہیں۔ مگر دراصل وہ خیالات بے چارے بھکاری کے نہیں ہوتے مکالمہ نویس کے ہوتے ہیں جو شاید اپنے ایرکنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھ کر فٹ پاتھ کا فلسفہ سوچتا ہے۔

پھر بھی اتنا میں ضرور جانتا ہوں کہ بہار کا موسم آگیا ہے۔ اور شاید میری زندگی میں بھی بہار آگئی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ گھنٹوں گل مہر کے پھولوں کو دیکھتا رہوں۔ اور اس سے بھی زیادہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں چمپا کو دیکھا کروں۔ چمپا جس کا حسن فٹ پاتھ کی اس گندی دنیا میں اتنا ہی عجیب اور حیرت انگیز

ہے جیسے کیچڑ میں اُگا ہوا کنول۔ یا سوکھی ہوئی ٹہنیوں پر کھلے ہوئے سُرخ
پھول۔

مجھے نہیں معلوم وہ کہاں سے آئی ہے۔ مگر میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ
وہ خوب صورت ہے۔ اس کی سانولی رنگت میں نمک بھی ہے اور پرانے سونے
جیسی ایک ہلکی سی پیلاہٹ بھی ہے۔ بڑی بڑی خوب صورت آنکھیں جو پلکوں
کی جالیوں میں سے ایسے جھانکتی ہیں جیسے کوئی پردے دار حسینہ ــــ لمبے چکیلے
سیاہ بال جن کو وہ اکثر ایک ٹوٹے ہوئے کنگھے سے بیٹھی بیٹھی سنوارا کرتی ہے اور ایسا
لگتا ہے کہ ان بالوں میں بھی جان ہے۔ اپنی الگ شخصیت ہے۔ کبھی وہ ہوا
کے جھونکے سے چمپا کے چہرے پر بکھر جاتے ہیں، کبھی وہ کنگھے کے ٹوٹے ہوئے
دانتوں سے الجھ جاتے ہیں، کبھی وہ لمبی چوٹی کی شکل میں ناگن بن کر دیکھنے والوں
کو ڈستے ہیں۔ کبھی وہ جوڑا بن کر سمٹ جاتے ہیں۔ چمپا کے پاس زیور تو
کیا کوئی ڈھنگ کا کپڑا بھی نہیں ہے۔ جوانی سے گدرایا ہوا اس کا بدن
میلے گندے چیتھڑوں میں ملبوس رہتا ہے۔ لیکن اس کے گھنے، لمبے،
چمکیلے سیاہ بال زیور اور گہنوں، ریشمی ساڑھیوں اور ہر قسم کی آرائش سے
زیادہ خوب صورت اور دلکش ہیں۔

اپنے کونے میں بیٹھا بیٹھا میں چمپا کو گھورتا رہتا ہوں۔ ہمارے فٹ پاتھ
پر جتنے لوگ بھی رہتے ہیں سب ہی اس کو گھورتے ہیں۔ مگر میں جانتا ہوں
کہ وہ مجھے ایک خاص نظر سے دیکھتی ہے۔ اور شاید یہ اتفاقیہ مڈبھیڑ نہیں تھی
کہ کل سویرے ہم نل پر منہ دھونے ایک ساتھ ہی پہنچے۔ اور جب نل بند

کرتے ہوئے میرا ہاتھ اتفاقیہ اُس کے ہاتھ کو چھو گیا تو اُس نے میرا ہاتھ جھٹکا نہیں، نہ اُس کی تیوری پر ناراضگی کا کوئی بل آیا۔ بلکہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اسے یہ لمس اچھا لگا — یا ممکن ہے یہ سب میرے اپنے تخیل کا کرشمہ ہو۔ .... بات یہ ہے کہ چمپا کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہے جیسی کئی لڑکیاں پچھلے دو برس میں مجھے فٹ پاتھ پر ملی ہیں۔ اُس کی آنکھوں کی گہرائی میں ایک عجیب درد چھپا ہے۔ — درد بھی اور خوف بھی — کبھی کبھی مجھے اس کی آنکھیں ہرنی کی طرح لگتی ہیں جو شکاریوں کے نرغے میں پھنسی ہوئی ہو اور جسے ہر لمحے گولی کھانے کا خوف ہو۔ یا شاید یہ ہرنی گولی کھا کر گھائل ہو چکی ہے .... مگر کبھی کبھی وہ اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی ہوتی ہے۔ اور اُسے نہیں معلوم ہوتا کہ کوئی اُسے دیکھ رہا ہے، لیکن میں کن انکھیوں سے دیکھتا ہوں۔ اُس وقت مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی خوب صورت سیاہ آنکھیں کسی حسین، پیارے تصور سے چمک رہی ہیں، اور اُس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر دھیمی سی خفیف سی بجھی بجھی مسکراہٹ اُبھر آئی ہے .... جیسے وہ اپنی زندگی کا کوئی بہت خوب صورت، بہت عزیز لمحہ یاد کر رہی ہو.........

چمپا کسی سے بات نہیں کرتی۔ گو ہر شخص نے اُس سے دوستی کرنے کی کوشش کی ہے اور کئی آوارہ نوجوانوں نے اُس کی طرف دیکھ کر سیٹیاں بجائی ہیں، آہیں بھری ہیں، پھبتیاں کسی ہیں۔ لیکن چمپا نے آج تک کسی کو منہ نہیں لگایا۔ دنیا میں اس کا صرف ایک دوست اور ساتھی ہے — وہ ہے ایک لنگڑی، خارش زدہ، بھوک کی ماری کُتیا جسے وہ موتی موتی کہہ کر پکارتی

ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی خوب صورت جوان لڑکی اتنے بدصورت اور مکروہ جانور سے کیسے پیار کر سکتی ہے۔ لیکن فٹ پاتھ کی دنیا میں انوکھے کردار رہتے ہیں، عجیب و غریب واقعات ہوتے ہیں، اور اسی لئے تھوڑے دنوں ہی میں ہم چمپا اور اس کی کُتیا کو بھی اپنے فٹ پاتھ کی چھوٹی سی برادری میں شامل سمجھنے لگے ہیں۔ گو وہ اب بھی ہم میں سے کسی سے بات نہیں کرتی . . . . . .

دن میں چمپا کیا کرتی ہے۔ یہ مجھے کیا کسی کو بھی نہیں معلوم۔ لیکن ہر شام کو جب کام سے لوٹ کر میں آتا ہوں تو میرا دل اس خوف سے دھڑکتا ہوتا ہے کہ شاید وہ ہمارا فٹ پاتھ چھوڑ کر کہیں اور چلی گئی ہو۔ لیکن جب میں دیکھتا ہوں کہ وہ موجود ہے اور اپنے کونے میں بیٹھی موتی سے باتیں کر رہی ہے۔ جیسے وہ کُتیا نہ ہو اُس کی سہیلی ہو، اُس وقت مجھے ایک عجیب اطمینان اور خوشی کا احساس ہوتا ہے اور بے اختیار میں کوئی گیت گنگنانے لگتا ہوں۔

اور رات کو جب ہم سب اپنے چیتھڑے یا ردی کاغذ بچھا کر اپنے اپنے بستر تیار کرتے ہیں تو وہ چار من چلے ہمیشہ اس کی تاک میں رہتے ہیں کہ چمپا کے کونے کی طرف سرکتے جائیں۔ رگھیا جس کا سیاہ جسم پہلوانوں جیسا ہے اور بنسی جو دُبلا پتلا ہے۔ اور ہمیشہ پان کھاتا ہے اور فلمی گیت گاتا رہتا ہے اور جو کسی سنیما کے سامنے ٹکٹوں کا کالا بازار کرتا ہے۔ ان دونوں کی گندی نگاہیں۔ ہمیشہ چمپا کا پیچھا کرتی رہتی ہیں۔ لیکن چمپا اطمینان کی نیند سوتی ہے اس لئے کہ رات بھر موتی اُس کے سرہانے بیٹھی چوکیداری کرتی ہے اور اگر کوئی چمپا کی سمت میں ایک قدم بھی بڑھاتا ہے تو وہ اتنے زور سے

بھونکنے لگتی ہے کہ ہر کوئی جاگ اٹھتا ہے اور مجرم شرمندہ ہو کر بڑبڑاتا ہوا اپنے بستر پر واپس آ کر لیٹ جاتا ہے۔ کل رات تو موتی نے رگھیا کی ٹانگ ہی پکڑ لی تھی۔ اگرچہ وہ یہی کہے جا رہا تھا کہ میں تو نل پر پانی پینے جا رہا ہوں۔ مگر کتیا بھونکے جا رہی تھی اور ہم لوگوں کا ہنسی کے مارے برا حال تھا۔

سنا ہے آج رگھیا نے ہسپتال جا کر پیٹ میں سوئے لگوائے ہیں۔ مجھے موتی کی یہ حرکت بہت پسند آئی۔ اسی لئے کہ مجھے چمپا سے کافی دلچسپی پیدا ہو چلی ہے بلکہ شاید دلچسپی سے بھی زیادہ ....

نو سو ساتویں رات

ایک آدمی۔ ایک عورت۔ ایک جانور

آج رات میں بہت خوش ہوں۔ اتنا خوش ہوں کہ سو نہیں سکتا۔

آج رات چمپا نے مجھ سے بات کی —— پہلی بار۔ شام کو جب میں کام سے واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ فٹ پاتھ پر سناٹا ہے۔ تب مجھے یاد آیا کہ دیوالی کی رات ہے۔ اس لئے ہمارے فٹ پاتھ کے سب پڑوسی روشنیاں دیکھنے، بھیڑ میں جیبیں کاٹنے، بھیک مانگنے اور مندروں میں سے مفت مٹھائی لانے گئے ہوئے ہیں۔ صرف چمپا وہاں موجود تھی اور وہ نل کے پاس بیٹھی ہوئی اپنی کتیا کو نہلا رہی تھی۔

میرا جی چاہا کہ دوسروں کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر چمپا سے بات کروں مگر پھر میں نے سوچا شاید جھڑک دے۔ اس لئے میں نے

صرف کھنکار کر اپنی واپسی کا اعلان کیا اور پھر چٹائی کو زور زور سے جھٹک کر جھاڑا۔

"اری موتی" چمپا نے بظاہر کتیا سے کہا "تو دیوالی کی روشنیاں دیکھنے نہیں جائے گی؟"

کتیا نے اپنا گیلا سر زور سے ہلایا اور پانی کے ننھے ننھے قطرے ہوا میں اُڑنے لگے۔ میں سمجھ گیا کہ سوال دراصل مجھ سے کیا گیا ہے۔ لیکن پھر بھی مجھ میں براہ راست بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

پھر وہ بولی ـــــ "لگتا ہے، تجھے بھیڑ میں ڈر لگتا ہے؟ آج سڑکوں پر لوگ بھی تو بہت ہوں گے۔"

اس بار میں بول ہی پڑا "تم ٹھیک کہتی ہو چمپا۔ میں بھیڑ بھاڑ کو پسند نہیں کرتا۔ جتنے زیادہ لوگ ہوتے ہیں میں اتنی ہی تنہائی محسوس کرتا ہوں۔"

اس کو معلوم تھا کہ میں کچھ کہوں گا۔ لیکن پھر بھی جب میں نے براہِ راست اُس سے بات کرنے کی جرأت کی تو وہ کسی قدر گھبرا سی گئی۔

پھر وہ اُٹھی اور کتیا سے ـــــ یا مجھ سے ـــــ بولی ـــــ "چلو ہم بھی دیوالی کی روشنیاں دیکھ آئیں ـــ مگر دیکھنا۔ بھیڑ بھڑکے سے دور ہی رہنا۔"

ایک آدمی ـــ ایک عورت ـــ ایک جانور........ ہمارا عجیب و غریب جلوس شہر کی طرف روانہ ہوا۔ چمپا نے حیرت اور خوشی سے جگمگاتی ہوئی اونچی اونچی عمارتیں دیکھیں اور میں نے ان تمام روشنیوں کو چمپا کی آنکھوں میں جھلملاتا ہوا دیکھا۔ پھر بھی ہم نے کوئی بات نہیں کی۔ خاموشی

سے چلتے رہے۔ واپس ہوتے وقت ہم ایک بڑی شاندار دوکان کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ جس کی شیشے کی کھڑکیوں میں رنگ برنگ کی ریشمی ساڑھیاں اور سونے چاندی کے زیور گہنے سجے ہوئے تھے۔ ایک لمحے کے لئے چمپا ان ساڑھیوں کے سامنے ٹھہری اور میں نے اس کے چہرے کا عکس شیشے میں دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب آرزو تھی اور ایک عجیب مایوسی۔ اور وہ ان ساڑھیوں کو ایسے دیکھ رہی تھی۔ جیسے وہ صرف ریشمی ساڑھیاں نہیں تھیں بلکہ آرام اور آسائش اور سنگھار اور آرائش کی وہ تمام چیزیں تھیں جن سے اُس کی زندگی محروم تھی۔

اور میرا جی چاہا کہ میں چلا کر اُس سے کہوں "چمپا۔ میری اپنی چمپا۔ ایک دن میں تمھیں یہ سب چیزیں دوں گا —— یہ ریشمی ساڑھیاں، یہ زیور، گہنے، میں تمھیں دنیا کی سب خوبصورت چیزیں نذر کر دوں گا اس لیے کہ تم خوب صورت ہو، جوان ہو اور تمھارا حق ہے کہ تمھارے بدن پر ایسی رنگین ساڑھیاں ہوں، تمھارے کانوں میں یہ سنہری آویزے جھولتے ہوں اور تمھارے ماتھے پر وہ جھومر جگمگاتا ہو۔ یہی نہیں میں تو تمھیں ان سے بھی زیادہ خوب صورت اور پیاری چیزیں دینا چاہتا ہوں۔ ایک محنت کرنے والا شوہر، ایک چھوٹا سا گھر۔ اولاد .... کاش تم ایک بار مجھ سے کچھ مانگو تو سہی۔"

مگر اُس نے مجھ سے کچھ نہیں مانگا۔ اُس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ صرف ایک ہلکا سا ٹھنڈا سا سانس بھرا اور اپنی گڈیا سے کہا "چل موتی۔"

گھر چلیں۔"

"گھر؟" وہ اس فٹ پاتھ کو "گھر" کہتی ہے؟ —— وہ چند چیتھڑوں اور چند ٹھیکروں کو گھر کہتی ہے؟ —— اوہ چمپا —— کاش میں تجھے ایک سچ مچ کے گھر میں لے جا سکتا.......

اور اب آدھی رات گزر چکی ہے۔ سب سو رہے ہیں۔ اور میں اپنی ڈائری لکھ رہا ہوں۔ گیس کی پیلی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی ہے۔ اور وفادار موتی پائنتی بیٹھی چوکیداری کر رہی ہے۔ اس وقت چمپا اور بھی حسین نظر آتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ سوتے ہوئے وہ اپنی زندگی کی سب محرومیوں، سب تکلیفوں کو بھول جاتی ہے۔ اس کے ہونٹوں پر ایک معصوم سی مسکراہٹ ہے جیسے وہ کوئی سکھ بھرا سپنا دیکھ رہی ہو۔ اور میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس کے مسکراتے ہوئے خوابوں میں میرے لئے بھی کوئی جگہ ہے یا نہیں.......

نوسو چوتالیسویں رات

خوشخبری —— "مگر کب؟"

ہم فٹ پاتھ پر رہنے والوں کو سیاست، الیکشن، کانگریس، سوشلسٹ پارٹی، کمیونسٹ پارٹی، لوک سبھا، پنج سالہ پلان سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کیونکہ ہمیں یہ سب چیزیں اپنی زندگی سے بالکل غیر متعلق معلوم ہوتی ہیں۔ اخباروں میں ہم ضرور دلچسپی لیتے ہیں۔ لیکن صرف ردی اخباروں میں فٹ پاتھ پر بستر

بچھانے اور کبھی کبھی اوڑھنے کے لیے۔

لیکن آج صبح میں سو کر اُٹھا اور اپنا کاغذی بستر لپیٹنے لگا تو اخبار میں ایک سُرخی دیکھی "بے گھروں کے لیے گھر بنیں گے"۔ ساری خبر پڑھی تو معلوم ہوا کہ سرکار نے کئی ہزار چھوٹے چھوٹے گھر بنانے کا پلان بنایا ہے اور یہ گھر ہمارے جیسے غریبوں کے لیے بنیں گے۔ میں نے وہ خبر پیپر میں سے پھاڑلی اور احتیاط سے لپیٹ کر جیب میں رکھ لی۔ بائیں طرف کے جیب میں۔ اپنے دل کے قریب۔ نہ جانے کیوں دن بھر مجھے بڑا اطمینانِ قلب محسوس ہوتا رہا۔ اور ہر کام میں بڑی پھرتی اور خوش دلی سے کرتا رہا! اور دفتر کے منیجر کی ڈانٹ سُننی پڑی۔ کیونکہ میں دفتر میں بڑے زور سے سیٹی بجا رہا تھا۔

شام ہوتے ہی میں سیدھا گھر یعنی اپنے فٹ پاتھ پر واپس آیا۔ کھانا بھی نہیں کھایا۔ اس وقت تک اور لوگ اپنے اپنے کام سے نہیں لوٹے تھے۔ چمپا اکیلی بیٹھی موتی سے باتیں کر رہی تھی۔

"چمپا ـــــ چمپا ـــــ" آج میں نے براہِ راست اُسے نام لے کر پکارا ـــــ "دیکھ تو یہی اس پیپر میں کتنی اچھی خبر چھپی ہے!" اور میں نے وہ تراشہ جیب سے نکال کر اُسے دے دیا۔

اُس نے کاغذ کو پڑھے بغیر نفی میں سر ہلایا "میں تو اَن پڑھ ہوں۔ تم ہی بتاؤ کیا لکھا ہے؟"

"لکھا ہے کہ سرکار ہمارے جیسے بے گھروں کے لئے جو فٹ پاتھ پر سوتے ہیں گھر بنا رہی ہے۔" میں بڑے جوش سے بات کر رہا تھا: "ہے

بڑی اچھی خبر۔ اب ہم فٹ پاتھ پر سونے کے بجائے اپنے گھر میں رہیں گے۔ اپنے گھر میں ـــــ میں ـــــ اور تم ـــــ سمجھیں نہ چمپا؟"

اُس نے سر ہلا کر ہاں کہا ـــــ اور پھر ایک عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ جو مسکراہٹ بھی تھی اور ٹھنڈا سانس بھی اُس نے پوچھا "مگر کب؟"

اب مجھے ساری خبر کو غور سے پڑھنا پڑا۔ لکھا تھا کہ ان گھروں کو بنانے کا کام تو جلد شروع ہو جائے گا۔ مگر اندازہ کیا جاتا ہے کہ سب بے گھروں کو بسانے کے لئے کافی تعداد میں مکان بنانے میں کم سے کم دس برس لگیں گے۔

دو لفظوں "مگر کب؟" سے میرا سویرے والا جوش کسی قدر مدھم پڑ گیا ہے۔ لیکن پھر بھی میں مایوس نہیں ہوں۔ بلکہ امید اور دعا کر رہا ہوں کہ جب یہ گھر بن کر تیار ہونے شروع ہوں تو ہمارا ـــــ یعنی میرا اور چمپا کا ـــــ گھر پہلے بن جائے ـــــ اور لوگ انتظار کر سکتے ہیں ـــــ مگر مجھے جلدی ہے ـــــ شادی کرنی ہے۔ گرہستی بنانی ہے .... پھر بچے بھی ضرور ہوں گے ـــــ اس لئے جلد سے جلد ہمیں گھر ملنا چاہئے ......

نو سو چھتر ویں رات

ہمارا گھر ـــــ ہمارا گھر

آج رات تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ اور تو اور چمپا بھی اپنی خاموشی کے گنبد سے نکل رہی ہے۔ میں ڈائری لکھ رہا ہوں اور وہ اپنی

کے چولھے پر مٹی کی ہانڈی میں دال پکا رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے وطن کا ایک لوک گیت گنگنا رہی ہے۔ میں اس گیت سے واقف ہوں۔ یہ گیت گاؤں کی عورتیں شادی کے موقع پر گاتی ہیں۔

چمپا کو خوش اور بشاش اور گاتا ہوا دیکھ کر فٹ پاتھ پر سونے والے سب حیران ہیں۔ صرف ایک مجھے تعجب نہیں ہے اس لئے کہ مجھے چمپا کی خوشی کی وجہ معلوم ہے۔

آج ہم اپنے گھر کو دیکھنے گئے تھے جس میں ہم شادی کے بعد رہنے والے ہیں۔

ہوا یہ کہ ہمارے فٹ پاتھ کے قریب کئی دن سے بڑا ہنگامہ ہے روشنیاں لاؤڈ اسپیکر کی چیخ پکار ——— ہزاروں لوگوں کا مجمع۔ رات کے ایک بجے تک میلہ سا لگا رہتا ہے۔ ہمارا سونا مشکل ہو گیا ہے۔ یہ کوئی نمائش ہو رہی ہے۔ دروازے پر بورڈ لگا ہے "پنج سالہ پلان"۔

جیسا میں نے پہلے بھی اس ڈائری میں لکھا ہے ہم فٹ پاتھ پر رہنے والے ایسی باتوں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لیتے۔ کیونکہ ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ یہ پلان اور پراجیکٹ ہماری زندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ لیکن جب میں نے بورڈ پر لکھا دیکھا "پنج سالہ پلان" تو میری یاد میں گھنٹی سی بجی۔ کیونکہ اُس خبر میں جس کا تراشہ اب تک میری جیب میں محفوظ تھا لکھا تھا کہ دوسرے پنج سالہ پلان میں بے گھروں کے لئے گھر بنانے کی سکیم بھی شامل ہے۔

سو میں نے سوچا اس نمائش میں جا کر دیکھنا چاہئے۔ بھیڑ کے ساتھ بہتا ہوا

میں بھی اندر پہنچ گیا۔ بڑی عجیب و غریب چیزیں دیکھیں۔ تصویریں، نقشے،
پانچ سال میں یہ ہوگا۔ پانچ سال میں وہ ہوگا۔ اتنے انجن بنیں گے ــــــ
اتنے ہزار میل ریل کی پٹڑی بنیں گی۔ اتنے اسکول۔ اتنے کالج۔ اتنے اسپتال
اور میں دل ہی دل میں کہتا رہا ـــــ ہمیں کیا؟ ہمیں کیا؟ ــــ لیکن ایک چیز
ایسی بھی دیکھی۔ جس میں مجھے بہت دلچسپی ہے۔ اور جو میں دیکھنا چاہتا تھا۔ کئی
منٹ میں اس کے سامنے کھڑا رہا۔ پھر میں وہاں سے بھاگا۔ اپنے فٹ پاتھ
پر آیا اور کسی کی پروا کیے بغیر چمپا کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اُٹھایا اور اسے گھسیٹتا ہوا
نمائش میں لے گیا۔

"دیکھ چمپا ــــ ہمارا گھر" ــــ میں نے ماڈل کی طرف اشارہ کرتے
ہوئے خوشی سے چلّا کر کہا۔ وہ گھر نہیں تھا۔ صرف گھر کا ماڈل تھا جیسا گڑیوں
کا گھر ہوتا ہے۔ لیکن اس پر جو بورڈ لگا تھا اُس پر لکھا تھا: "سب گھروں کے
لئے ہزاروں ایسے گھر بنائے جائیں گے۔"

کتنی ہی دیر ہم اُسی گڑیا گھر کے سامنے کھڑے اُسے حیرت اور خوشی سے
تکتے رہے۔ ایک کمرہ۔ ایک رسوئی گھر۔ ایک برآمدہ۔ آنگن میں ایک پیڑ
اور پیڑ کے نیچے تین ننھی منی گڑیاں۔ تین بچے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہماری
ساری آرزوئیں۔ ہمارے سارے سپنے اُس ماڈل میں سمٹ آئے ہیں۔
جب ہم وہاں سے لوٹے تو میں نے دیکھا کہ چمپا کی آنکھوں میں خوشی کے
آنسو ہیں۔

اب وہ سو رہی ہے اور اس کے چہرے پر ایک اطمینان اور امید اور

خوشی کی مسکراہٹ ہے۔......

نو سو اٹھترویں رات

موت کا سایہ

ہمارے سکھ کے سپنوں پر موت نے اپنا بھیانک سایہ ڈال دیا ہے۔

چمپا کی کُتیا موتی مر گئی ہے۔ کسی نے اُسے زہر دے دیا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ موتی کے ساتھ چمپا کے دل کا ایک ٹکڑا بھی کٹ گیا ہے۔ زہر کس نے دیا، اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ لیکن رگھیا اتنا خوش کیوں نظر آتا ہے؟۔۔۔ ہو سکتا ہے یہ قتل اسی نے کیا ہو۔

بڑی دیر تک تو چمپا موتی کو گود میں لئے بیٹھی رہی اور اس کی خاموش آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔ پھر وہ اُٹھی اور دونوں ہاتھوں پر لاش کو اٹھائے ۔۔۔ جیسے باپ اپنے بچے کی لاش کو لئے شمشان جاتا ہے ۔۔۔ سمندر کی طرف چلی گئی۔ خاموشی سے مڑ کر اس انداز سے مجھے دیکھا کہ میں وہیں ٹھہر گیا اس کی آنسو بھری آنکھیں کہہ رہی تھیں "تم مت آؤ۔ اس وقت میں اکیلی ہی جانا چاہتی ہوں"۔۔۔

گھنٹہ بھر بعد وہ واپس آئی۔ خالی ہاتھ۔ اس وقت اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ وہ اتنی خاموش اور ساکت تھی کہ ڈر لگتا تھا کہیں دماغ پر تو کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے اُسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ کھانے کو بھی کہا لیکن چمپا نے جواب میں میری طرف نگاہیں اٹھا کر حیرت سے دیکھا۔ جیسے کہہ رہی ہو۔

"میری پیاری موتی مر گئی ہے۔ آج کی رات میں کیسے کھانا کھا سکتی ہوں؟" اور میں خاموش ہو گیا۔

رگھیا نے چلا کر کہا: "کیوں۔ چمپا۔ اب تیری چوکیداری کون کرے گا؟ کتیا تو مر گئی۔ اُس کے بجائے اپنی حفاظت کے لئے مجھے رکھ لے"۔۔۔ اور یہ کہہ کر اپنے مذاق پر وہ خود ہی ہنسا۔ مگر کسی نے اس ہنسی میں اُس کا ساتھ نہ دیا۔ چمپا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف خاموشی سے ایک بار رگھیا کی طرف دیکھا۔ لیکن اس ایک نگاہ میں اتنی نفرت اور حقارت تھی کہ رگھیا کے چہرے سے ہنسی غائب ہو گئی اور وہ کھسیانہ ہو کر کھانے لگا۔

پھر چمپا نے اپنے چیتھڑوں کی گدڑیوں کا پلندہ اٹھایا اور ہم سب سے دور فٹ پاتھ کے کنارے پر اپنا بستر بچھایا اور اس پر خاموشی سے لیٹ گئی لیکن وہ سوئی نہیں ہے جب سے لیٹی ستاروں بھرے آسمان کو تک رہی ہے۔

اور میں بھی جاگ رہا ہوں۔ کیونکہ موتی مر گئی ہے اور چمپا کی حفاظت کرنے والا کون ہے ۔۔۔ سوائے میرے؟ ۔۔۔

نو سو نواسویں رات

خواب کی تصویر

بزرگوں نے کچھ غلط نہیں کہا کہ وقت سب کچھ بھلا دیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ آہستہ آہستہ چمپا بھی موتی کے غم کو فراموش کرتی جا رہی ہے۔ آج شام کو جب میں کام سے واپس آیا تو اس نے ایک ڈھیمی سی پیلی سی سگریٹ کا بٹ ...

ساتھ میرے سلام کا جواب دیا۔

آج میں اس کے لئے ایک تحفہ لایا تھا۔ اپنے اور اُس کے خوابوں کے گھر کی تصویر۔ یہ اُسی گڑیا گھر کی تصویر تھی جو ہم نے "پنج سالہ پلان" والی نمائش میں دیکھا تھا۔ ہمارے خوابوں کی یہ تصویر رنگین تھی۔ لال اینٹوں کا مکان۔ چمنی میں سے کالا کالا دھوآں نکلتا ہوا۔ آنگن میں پیڑ کے ہرے گھنے پتے۔ اُن میں سُرخ پھول۔ دو بچیاں۔ ایک نیلا فراک پہنے ہوئے دوسری نارنجی۔ ایک کے ہاتھ میں پیلے رنگ کا غبارہ دوسری کے ہاتھ میں اودے رنگ کا غبارہ۔ لڑکے بدن پر سفید قمیص۔ خاکی نیکر، کالے چمکتے ہوئے جوتے .... زمین پر ہری ہری گھاس ....

"یہ .... یہ تصویر میں رکھ لوں ؟" چمپا نے کہا اور میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں امید اور خوشی سے چمک رہی ہیں۔ میں نے کہا "ہاں اور کیا۔ تمہارے لئے ہی تو لایا ہوں" اور اُس کی بڑی بڑی آنکھوں نے خاموشی سے میرا شکریہ ادا کیا۔ کتنی محبت تھی اُن آنکھوں میں۔ کتنا تشکر۔ اُن آنکھوں میں امیدیں اور آرزوئیں بھی تھیں اور عہد و پیمان بھی۔ اور میرے لئے تو ان آنکھوں میں زندگی کا سب سے اہم پیغام تھا۔

کتنی ہی راتوں کے بعد آج چمپا اطمینان سے گہری نیند سو رہی ہے۔ آخری ٹرام گھڑگھڑاتی ہوئی گزر چکی ہے۔ یونیورسٹی کلاک ٹاور دو بجا چکا ہے ..... اور اب نیند کے مارے میری آنکھیں بھی بند ہوئی جا رہی ہیں.....

نوسونویں رات

گھر بنا ہی نہیں اور گر گیا

مجھے نہیں معلوم تھا کہ ایک رات میں ـــــ بلکہ چند لمحوں میں ـــــ زندگی ختم ہو جائے گی اور زندگی کی تمام اُمنگیں، آرزوئیں، زندگی کے تمام حسین خواب اور مستقبل کی پوری عمارت شیشے کے گھر کی طرح یک لخت چکنا چور ہو جائے گی۔

کل رات دو بجے کے بعد جب میری آنکھ لگی تو میں نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ پہلے بھی کئی بار میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ ہمارا گھر بن رہا ہے۔ اس کی دیواریں اونچی ہوتی جا رہی ہیں، اُن پر چھت ڈالی جا رہی ہے فرش پر سیمنٹ ہو رہا ہے۔ دیواروں پر سفیدی ہو رہی ہے۔ لیکن اس بار میں نے دیکھا کہ گھر تیار ہو گیا ہے اور ہم اس میں اُٹھ آئے ہیں۔ رسوئی گھر میں چمپا بیٹھی کھانا پکا رہی ہے۔ آنگن والے گل مہر کا پیڑ سُرخ سرخ پھولوں سے لدا ہوا ہے اور ہری ہری گھاس پر ہمارے ننھے ننھے ـــــ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا ـــــ گیند بلا کھیل رہے ہیں۔ اور پھر دفعتاً آسمان پر کالے بادل چھا گئے۔ بجلی کوندنے لگی۔ اور طوفانی بادلوں کی کڑک سے ہمارا چھوٹا سا گھر کانپنے لگا۔ چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ اندھیرا اور آندھی اور طوفان ساری زمین ہل رہی تھی۔ اور پھر میں نے دیکھا کہ کالے آسمان پر بجلی کوندی اور ہمارے گھر کی طرف لپکی ...... بجلی کی چمک میں میں دیکھ رہا تھا کہ چمپا رسوئی میں کھانا

پکار رہی ہے اور میرے بچے پیڑ کے نیچے کھڑے ہیں۔ اور وہ سب اُس آتشیں تلوار کی زد میں ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ چلاؤں "چمپا۔ باہر آ جاؤ۔ بچو پیڑ کے نیچے سے ہٹ جاؤ"...... مگر میں دفعتاً گونگا ہو گیا تھا۔ میرے منہ سے آواز ہی نہ نکلی۔ ایک شعلہ سا بھڑکا۔ ایک ہیبت ناک تڑاخا ہوا۔ اور پھر اندھیرا چھا گیا۔ اور اُس اندھیرے میں ہمارے گھر کے گرنے کی آواز ایسی آئی جیسے کوئی کار دیوار سے ٹکرائی ہو اور بریک لگنے کی خوفناک چیخ کے ساتھ کتنے ہی شیشے چھن چھن کر کے ٹوٹ گئے ہوں......

میں گھبرا کر اُٹھا اور صبح کی دُھندلی روشنی میں دیکھا کہ سارے فٹ پاتھ پر کھلبلی سی مچی ہوئی ہے۔ ایک بڑی سی خوب صورت کالی کار اپنے اگلے دونوں پہیے ہوا میں اُٹھائے دیوار سے بغلگیر ہو رہی ہے۔ اس کے پہیے اب تک گھوم رہے ہیں۔ اور گھومتے ہوئے ٹائروں پر سے گہرے سرخ رنگ کی بوندیں ٹپ ٹپ کر کے فٹ پاتھ پر گر رہی ہیں۔ خون۔ چمپا کا خون!

پاگلوں کی طرح میں اُدھر دوڑا جہاں اُس کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ بھاری ظالم موٹر نے اُس کے دُبلے پتلے بدن کو پیس کر رکھ دیا تھا لیکن اس کے چہرے پر ایک خراش بھی نہ آئی تھی۔ اور اس کے ہونٹوں پر اب بھی وہی مسکراہٹ تھی۔ جیسے وہ مری نہ ہو بلکہ کوئی بڑا سندر بڑا میٹھا سپنا دیکھ رہی ہو۔ اور اُس کے داہنے ہاتھ کی مٹھی میں ایک تہہ کیا ہوا کاغذ تھا ــــ اُس گھر کی رنگین تصویر جو بننے سے پہلے ہی کھنڈر ہو گیا تھا!

کالا سوٹ پہنے ہوئے ایک نوجوان جو وسکی کے نشے میں تھا۔ گاڑی

میں سے کھینچ کر نکالا گیا۔ ہوش آتے ہی وہ بڑبڑایا: "ح۔ چ۔ چ۔ سٹیرنگ وھیل نہ جانے کیسے ایک دم ٹوٹ گیا۔ ہاں!........" اور پھر چمپا کی لاش کو دیکھ کر "اوہ آئی ایم سوری! مگر نہ جانے یہ لوگ فٹ پاتھ پر کیوں سوتے ہیں؟"
اور میرے جی میں آئی کہ اُسے بتاؤں لوگ فٹ پاتھ پر کیوں سوتے ہیں اور کیوں چمپا سب سے دور فٹ پاتھ کے بالکل کنارے پر سو رہی تھی۔ مگر اُس وقت میں گونگا ہو گیا تھا۔ ایک لفظ زبان سے نہ نکلا۔ مبہوت ہو کر صرف دیکھتا اور سنتا رہا۔

پولیس والے نے کار کے مالک سے اُس کا پتہ پوچھا تو اُس نے مالابار ہل پر ایک بلڈنگ کا نام بتایا۔
"فلیٹ کا نمبر؟" سپاہی نے نوٹ بک میں لکھتے ہوئے پوچھا۔ اور اُس کالے سوٹ والے نوجوان نے جواب دیا "ساری بلڈنگ ہی ہماری ہے۔"

اور اب سرکاری خرچ پر چمپا کا کریا کرم ہو چکا ہے۔ چتا کے شعلوں میں وہ راکھ ہو چکی ہے۔ اب رہا کیا ہے؟ —— فٹ پاتھ پر اُس کے خون کا ایک دھبہ۔

یہی سوچتے ہوئے میں ردّی اخبار کے کاغذوں کو بچھا کر لیٹنے کی تیاری کرتا ہوں۔ اس اخبار میں ایک بڑی اہم اور دلچسپ خبر چھپی ہے۔
بمبئی سرکار نے فٹ پاتھ پر سونے والے بے گھروں کے لئے ایک گھر بنایا ہے جہاں ساڑھے تین سو آدمیوں کو صرف پانچ آنے فی کس ادا

کرنے پر رات کو سونے کے لئے جگہ ملے گی۔

ہزارویں رات

"ہم ہیں صرف اُنیس ہزار نو سو ننانوے"

یہ میری اس ڈائری کا شاید آخری ورق ہے۔

اس وقت صبح کے چار بجے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں اُجالا ہونے والا ہے۔

چمپا کی یاد میں دس راتیں جاگ کر گزارنے کے بعد کل رات میں پہلی بار سو سکا تھا۔ ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ کسی نے مجھے جھنجھوڑ کر اُٹھا دیا۔

چند پولیس کے سپاہی اور چند سماج سدھار کے والنٹیر۔

"کیوں کیا ہے؟"

"تمھارا نام؟"

اس پوچھ گچھ کے دوران میں اُن میں سے ایک نے بتایا کہ اب بمبئی میں صرف بیس ہزار بے گھر لوگ ہیں جو فٹ پاتھ پر اپنی راتیں بسر کرتے ہیں۔ اور میں نے کہا ــــ "نہیں صرف اُنیس ہزار نو سو ننانوے۔ اس لئے کہ چمپا تو مر چکی ہے صرف اُس کے خون کا دھبہ رہ گیا ہے۔ سو وہ بھی ایک چھینٹا پڑتے ہی دھل جائے گا۔ آپ فکر نہ کیجئے"۔

اُنھوں نے مجھے اس طرح گھور کر دیکھا جیسے اُن کو شبہ ہو کہ میرا دماغ چل گیا ہے۔

پھر انھوں نے مجھ سے پوچھا "تم سرکاری ڈورمٹری میں کیوں نہیں رہتے۔ جہاں بے گھروں کے سونے کا انتظام کیا گیا ہے؟ کیا تم پانچ آنے روز خرچ نہیں کر سکتے؟"

میں نے کہا "میری آمدنی پینتالیس روپے ماہوار ہے۔ ـــــ" "پھر تم وہاں کیوں نہیں جاتے؟ یہاں فٹ پاتھ پر کیوں سوتے ہو؟"

کیوں؟

کیوں؟؟

کیوں؟؟؟

اُن کے سوالات کی بوچھاڑ ہوتی رہی اور میری زبان بند رہی۔

اب میں اُن کو کیا بتاؤں۔ کیسے بتاؤں۔ اگر بتا بھی پاؤں تو مجھے یقین ہے وہ میری بات نہیں سمجھیں گے۔

میں اُن سے کہنا چاہتا ہوں آپ نے میرے جیسے بے گھر لوگوں کے لئے سرکاری ڈورمٹری بنائی ہے ـــــ چلئے بیس ہزار نہیں تو ساڑھے تین سو کے لئے تو سونے کا انتظام کیا ہے ـــــ بہت اچھا کیا ہے۔ شکریہ۔ دھنیہ واد ـــــ بے حد۔ مگر سرکار میں ڈورمٹری میں دوسرے لوگوں کے ساتھ نہیں سونا چاہتا۔ میں ٹھیرا گھر گرہستی والا۔ مجھے۔ میری بیوی اور تین بچوں کو تو ایک الگ گھر۔ کم سے کم ایک الگ فلیٹ چاہئے۔ ایک کمرہ۔ ایک رسوئی گھر۔ اور آنگن میں سرخ پھولوں سے لدا ہوا گل مہر کا پیڑ......

مگر میں اُن سے کچھ بھی نہیں کہہ پایا اور وہ مجھے پاگل سمجھ کر چلے گئے۔ اور میں سڑک کے ہنڈے کے نیچے بیٹھا یہ ڈائری لکھ رہا ہوں۔

اور قریب ہی فٹ پاتھ پر چمپا کے خون کا دھبہ ہے جو کافی دھیا پڑ چکا ہے۔ آسمان پر بادل گھرنے شروع ہو گئے ہیں۔ جلد بارشیں شروع ہو جائیں گی۔ اور پھر یہ خون کا دھبہ بھی بمبئی کے دامن سے دھل جائے گا۔ پھر کیا رہے گا؟۔

یہ ہے پتھر کی سیج پر گزاری ہوئی ایک ہزار راتوں کی میری داستان۔

مکرر:۔ مجھے نہیں معلوم کون لوگ وہ بڑے بڑے پنج سالہ پلان اور پراجیکٹ بناتے ہیں لیکن اگر ان میں سے کسی کی نظر سے میری یہ ڈائری گزرے تو ان سے میری اتنی عرض ہے کہ بے گھروں کے لئے جو گھر آپ بنا رہے ہیں یہ بڑا کام ہے۔ اچھا کام ہے۔ لیکن بھگوان کے لئے جلدی کیجیے — اگر آپ مجھے اور میری چمپا اور ہمارے بچّوں کو بچانا چاہتے ہیں۔

بھارت ماتا کے پانچ رُوپ

خدا نے اپنے ہاتھوں سے مٹی کا ایک پُتلا بنا کر اس میں جان ڈالی یا ارتقا کے چکر سے بندر ترقی کرتے کرتے انسان بن گیا۔ یہ بحث برسوں سے چلی آرہی ہے۔ اور آج تک اس کا فیصلہ نہیں ہو سکا۔ مگر اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ انسان کو جنم دینے والی ہستی اس کی ماں ہوتی ہے نو مہینے تک ہونے والے بچے کو وہ اپنے خون سے سینچتی ہے۔ خود موت سے گزر کر زندگی پیدا کرتی ہے۔ ماں اور بچے کا نازک رشتہ اٹل اور امر ہے۔

جب ہی تو انسان کو جس چیز سے بھی زیادہ لگاؤ ہوتا ہے اس کو ماں کے رشتے سے یاد کرتا ہے۔ اپنے وطن کو "مادرِ وطن" "ماتر بھومی" یا "مدر لینڈ" کہتا ہے۔ اپنی یونیورسٹی یا کالج کو "الما میٹر" "مادرِ درسگاہ" یا "گیان ماں" کہتا ہے۔ زمین جو ایک پیار کرنے والی ماں کی طرح انسان کے لئے کھانا پینا مہیا کرتی ہے "دھرتی ماتا" کہلاتی ہے۔

ہم ہندوستانیوں نے تو ہزاروں برس سے اپنے دیش کی روح ہی کو "بھارت ماتا" کا لقب دے رکھا ہے۔ بھارت ماتا کی جے! وندے ماترم! ان دونوں قومی نعروں میں اپنے وطن کو "ماں" کہہ کر پکارا گیا ہے۔

لاکھوں بلکہ کروڑوں نے یہ نعرے لگائے ہوں گے۔ مگر شاید ہی کسی نے یہ سوچا ہو کہ یہ "بھارت ماتا" ہے کون ـــ یا کیا؟

پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب "تلاشِ ہند" میں لکھا ہے کہ انھوں نے کسانوں کے ایک مجمع سے پوچھا کہ ان کی رائے میں "بھارت ماتا" کیا ہے۔ ایک کسان نے جواب دیا کہ یہ دھرتی جس سے ہم جنم لیتے ہیں اور جو ہمیں کھانا کپڑا دے کر پالتی پوستی ہے، یہی ہماری "بھارت ماتا" ہے۔ پنڈت جی نے کسانوں کو بتایا کہ وہ سب .... یعنی ہندوستان کے سارے رہنے والے ہی مل کر "بھارت ماتا" کہلاتے ہیں۔

ایک طریقے سے یہ کہنا ضرور ٹھیک ہے کہ "بھارت ماتا" بھارت باسیوں کا مجموعی اور اشارتی نام ہے۔ پھر بھی اس اشارے کو نظر آنے والے ڈھنگ سے دکھانا ہو تو کسی مرد مزدور یا کسان کے روپ میں نہیں دکھایا جا سکتا۔ بھارت ماتا تو کوئی عورت ہی ہو سکتی ہے۔ مگر کیسی عورت؟

کیا بھارت ماتا آسمان میں رہنے والی کوئی دیوی ہے جو بھگوان کی طرف سے ہمارے دیش کی دیکھ بھال کے لئے مقرر ہے؟ کیا "بھارت ماتا" لمبے بالوں، گلابی گالوں، بڑھیا ریشمی ساڑھی اور سونے کے زیور سے لدی ہوئی کوئی موٹی تازی مہارانی ہے، جیسے وہ مورتیوں اور ڈراموں میں دکھائی

جاتی ہے ؟

نہیں ! اگر "بھارت ماتا" بتیس کروڑ ننگے بھوکوں کی ماں ہے تو وہ کوئی دیوی اپسرا یا رانی مہارانی نہیں ہو سکتی۔ وہ تو بھارت کی غریب ماؤں میں سے ہی ایک ہو سکتی ہے .... یا شاید ان میں ہر ایک ہو سکتی ہے۔ جس شکنتلا کے بیٹے بھارت کے نام پر یہ دیش آج بھارت کہلاتا ہے۔ وہ بھی تو ایک ایسی ہی ماں تھی۔ غریب، بے آسرا، بے سہارا۔ ایک سنیاسی باپ اور ایک نرتکی کی بیٹی۔ آشرم میں پلی ہوئی، شوہر کی بھلائی ہوئی، زمانے بھر کی ٹھکرائی ہوئی۔ پھر بھی وہ ماں تھی، جس نے اکیلے ہوتے ہوئے بھی اپنے بیٹے کو پالنے اور پروان چڑھانے کے لئے دنیا کی ہر مشکل اور مصیبت کا سامنا کیا ـــــــ غریبی، بھوک، بن باس ـــــــ جس نے اپنی قسمت سے ٹکر لی، اور اپنی ہمت سے اس پر فتح پائی۔

وہ تھی پہلی "بھارت ماتا" !

اور اس کے بعد نہ کیا اب ہمارے زمانے میں ایسی مائیں نہیں ہیں۔ جو بھارت ماتا کہلانے کا اتنا ہی حق رکھتی ہوں ؟

جب کبھی میں "بھارت ماتا کی جے" کا نعرہ سنتا ہوں میرے دماغ میں کتنی تصویریں اجاگر ہو جاتی ہیں .... چند معمولی عورتوں کی۔ گو ان میں سے کوئی کسی وجہ سے بھی مشہور نہیں ہے۔ ان کی تصویریں تو کیا ان میں سے کسی کا نام بھی آج تک اخباروں میں نہیں چھپا۔ پھر بھی ان میں سے ہر ایک بھارت ماتا" کہلانے کا حق رکھتی ہے۔

کھدر کا کفن

تیس برس کی بات ہے جب میں بالکل بچّہ تھا۔ ہمارے پڑوس میں ایک غریب بوڑھی جلاہی رہتی تھی۔ اس کا نام تو حکیمن تھا لیکن سب اسے حکّو کہہ کر پکارتے تھے۔ اس وقت شاید ساٹھ برس کی عمر ہوگی۔ اس کی جوانی میں ودھوا ہو گئی تھی۔ اور عمر بھر اس نے اپنے ہاتھ سے کام کر کے اپنے بچّوں کو پالا تھا۔ بوڑھی ہو کر بھی وہ سورج نکلنے سے پہلے اُٹھتی تھی۔ گرمی ہو یا جاڑا ابھی ہم اپنے اپنے لحافوں میں دبکے پڑے ہوتے تھے کہ اس گھر سے چکّی کی آواز آنی شروع ہو جاتی۔ دن بھر وہ جھاڑو دیتی، چرخہ کاتتی، کپڑا بُنتی، کھانا پکاتی، اپنے لڑکے لڑکیوں، پوتوں، نواسوں کے کپڑے دھوتی۔ اس کا گھر بہت ہی چھوٹا سا تھا۔ ہمارے اتنے بڑے آنگن والے گھر کے مقابلے میں وہ جوتے کے ڈبے جیسا لگتا تھا۔ دو کوٹھریاں، ایک پتلا سا دالان اور نام کے واسطے دو تین گز لمبا چوڑا صحن۔ مگر وہ اسے اتنا صاف سُتھرا اور لپا پتا رکھتی تھی کہ سارے محلے میں مشہور تھا کہ حکّو کے گھر کے فرش پر کھیلیں بکھیر کر کھا سکتے ہیں۔

صبح سویرے سے لے کر رات گئے تک وہ کام کرتی تھی۔ پھر بھی جب کبھی حکّو ہمارے گھر آتی ہم اسے ہشاش بشاش ہی پاتے۔ بڑی ہنس مکھ تھی وہ۔ مجھے اس کی صورت اب تک یاد ہے۔ گہرا سانولا رنگ۔ جس پر اس کے بگلا سے سفید بال خوب کھلتے تھے۔ .... اس کی کاٹھی بڑی مضبوط تھی۔ اس کی کمر مرتے دم تک نہیں جھکی۔ آخری دنوں میں کئی دانت ٹوٹ گئے تھے۔

جس سے بولنے میں پوپلے پن کا انداز آگیا تھا۔ بڑے مزے کی باتیں کرتی تھی۔ اور جب ہم بچے اسے گھیر لیتے تو کبھی تین شہزادوں، کبھی سات شہزادیوں، کبھی جنوں اور پریوں کی کہانیاں سُناتی.......... وہ پردہ نہیں کرتی تھی اپنا سارا کاروبار خود چلاتی تھی۔ حکو پڑھی لکھی بالکل نہیں تھی۔ نہ اس نے عورتوں مردوں کی برابری کے اصول کا ذکر سُنا تھا، نہ جمہوریت اور اشتراکیت کا، پھر بھی حکو نہ کسی مرد سے دبتی تھی، نہ کسی امیر، رئیس، افسر یا داروغہ سے ڈرتی تھی۔

حکو نے عمر بھر محنت کر کے اپنے بال بچوں کے لئے تھوڑا بہت پیسا جمع کیا تھا۔ بچاری نے بنک کا تو نام بھی نہ سُنا تھا۔ اس کی ساری پونجی (جو شاید سو دو سو روپے ہو، چاندی کے گہنوں کی شکل میں اس کے کانوں، گلے اور ہاتھوں میں پڑی ہوئی تھی۔ چاندی کی بالیوں سے جھکے ہوئے اس کے کان مجھے مجھے اب تک یاد ہیں۔ ان گہنوں کو وہ جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتی تھی۔ کیونکہ یہی اس کے بڑھاپے کا سہارا تھے۔ مگر ایک دن سب محلے والوں نے دیکھا کہ نہ حکو کے کانوں میں بالیاں ہیں، نہ اس کے گلے میں ہنسلی، نہ ہاتھوں میں کڑے اور چوڑیاں۔ پھر بھی اس کے چہرے پر وہی پرانی مسکراہٹ تھی اور کمر میں نام کو بھی خم نہیں۔

ہوا یہ کہ ان دنوں مہاتما گاندھی علی برادران کے ہمراہ پانی پت آئے۔ ہمارے نانا کے مکان میں انھوں نے تقریریں کیں۔ ترکِ موالات اور سوراج کے بارے میں۔ حکو بھی ایک کونے میں بیٹھی سُنتی رہی۔ بعد میں چندہ جمع کیا

گیا تو اس نے اپنا سارا زیور اُتار کران کی جھولی میں ڈال دیا۔ اور اس کی دیکھا دیکھی اور عورتوں نے بھی اپنے اپنے زیور اُتار کر چندے میں دے دیئے۔

اس دن سے حکو "خلافتی" ہو گئی۔ ہمارے ہاں آکر نانا ابا سے خبریں سنا کرتی اور اکثر پوچھتی...... "یہ انگریزوں کا راج کب ختم ہوگا؟" خلافت یا کانگریس کے جلسے ہوتے تو ان میں بڑے چاؤ سے جاتی اور اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق سیاسی تحریک کو سمجھنے کی کوشش کرتی ...... مگر عمر بھر کی محنت سے اس کا جسم کھوکھلا ہو چکا تھا۔ پہلے آنکھوں نے جواب دیا پھر ہاتھ پاؤں نے.... حکو نے گھر سے نکلنا بند کر دیا۔ مگر چرخہ کاتنا نہ چھوڑا۔ عمر بھر کی مشق کے سہارے آنکھوں بغیر بھی وہ کپڑا بُن لیتی۔ بیٹوں، پوتوں نے کام کرنے کو منع کیا تو اس نے کہا کہ وہ یہ کھدر اپنے کفن کے لئے بُن رہی ہے۔

پھر حکو مر گئی۔ اس کی آخری وصیت یہ تھی کہ "مجھے میرے بُنے ہوئے کھدر کا کفن دینا۔ اگر انگریزی کپڑے کا دیا تو میری رُوح کو کبھی چین نصیب نہ ہوگا"۔ ان دنوں کفن لٹھے کے دیئے جاتے تھے۔ کھدر کا پہلا کفن شاید ہی کو ملا حکو کا جنازہ اُٹھا تو اس کے چند رشتے دار اور دو تین پڑوسی تھے۔ نہ جلوس، نہ پھول، نہ جھنڈے، بس ایک کھدر کا کفن۔

کاش مجھے اُس وقت حکو کی اہمیت کا اتنا احساس ہوتا کہ میں کم سے کم ایک نعرہ لگا دیتا ــــــ "بھارت ماتا کی جے"۔

منو مہاراج کی ہار

منو مہاراج نے انسانیت کو چار درجوں میں تقسیم کیا۔ برہمن جو برہما کے

منہ سے پیدا ہوئے، کشتری جو برہما کے ہاتھوں سے پیدا ہوئے۔ ویش جو برہما کی ٹانگوں سے پیدا ہوئے۔ شودر جو برہما کے پیروں سے پیدا ہوئے .... اور ہمیشہ دوسری جاتیوں کے پیروں تلے روندے جاتے رہے۔ اور پھر ان سب سے الگ اور شودروں سے بھی زیادہ ناپاک تھے ملیچھ۔ دوسرے دھرموں کو ماننے والے۔ جن کے لئے منو مہاراج کی سماج میں قطعی کوئی جگہ نہیں تھی۔

منو کے زمانے میں یہ تقسیم عمل سماج کی ترقی کے لئے ضروری بھی تھی اور مفید بھی۔ بیرونی حملہ آوروں کے خلاف نفرت، کے ساتھ ساتھ حقارت کا جذبہ پیدا کرنا ہندو سماج کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری تھا۔ مگر پچھلے ہزار برسوں میں ذات پات کی تقسیم زیادہ سے زیادہ سنگین اور غیر عقلی ہوتی گئی۔ سماج میں مختلف تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ خانہ بدوشی سے زراعت، زراعت سے زمینداری اور جاگیرداری، جاگیرداری سے شہنشاہیت، شہنشاہیت سے غیر ملکی سامراج۔ اور سامراج سے سوراج۔ ایک دور کے بعد دوسرا دور آتا رہا۔ مگر ذات پات کا شکنجہ بدستور کسا رہا اور آج بھی بہت [illegible] کسا ہوا ہے۔

مگر کیا 'بھارت ماتا' جو سب ہندوستانیوں کی ماں ہے وہ بھی اپنے بچوں میں اس تقسیم اور طبقاتی درجوں کی قائل ہے؟ کیا وہ بھی برہمن اور شودر، ہندو اور مسلمان میں امتیاز کرتی ہے؟ ہونا تو نہیں چاہیے، کیونکہ ماں اپنے سب بچوں سے برابر کا پیار کرتی ہے۔ چاہے کوئی بچہ گورا ہو یا کالا [illegible]

ہو یا بدصورت، ذہین ہو یا کُند ذہن۔ مگر کہتے ہیں "بھارت ماتا" ان پڑھ ہے۔ قدامت پسند ہی نہیں قدامت پرست بھی ہے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ وہ منوجہاراج کے بتائے ہوئے راستے کو چھوڑ کر انسانی برادری اور برابری کا راستہ اختیار کر سکے؟

جب کبھی میں ان سوالوں کے بارے میں سوچتا ہوں، مجھے اپنے ایک دوست کی نانی یاد آجاتی ہیں جو پونا میں رہتی ہیں۔ یہ اسّی برس کی بوڑھی برہمن عورت زمانے کے بہت سے نشیب و فراز دیکھ چکی ہے۔ اس کے جھرّیوں بھرے چہرے پر ایک عجیب سکون ہے۔ جیسے وہ زندگی کے آخری بھید سے واقف ہو چکی ہو۔ اور اب اس کے دل میں موت کا ڈر بھی باقی نہ رہا ہو۔ نہ جانے کتنے برسوں سے وہ بیوگی کا جیون اپنے نواسوں نواسیوں کی خدمت کر کے گزارتی رہی ہے۔ گو اب اس کے ہاتھ پاؤں میں زیادہ کام کرنے کی سکت نہیں رہی پھر بھی اس عمر میں وہ گھر میں سب سے پہلے اُٹھتی ہے۔ ٹھنڈے پانی سے اشنان کرتی ہے اور پھر پوجا پاٹ میں لگ جاتی ہے۔

نانی سوائے مرہٹی کے کوئی دوسری زبان نہیں جانتی۔ اس کے بچپن میں لڑکیوں کو پڑھنا لکھنا نہیں سکھایا جاتا تھا۔ اس نے نہ کبھی اخبار پڑھا ہے نہ ریڈیو سُنا ہے نہ کبھی کسی سیاسی جلسے کسی لیڈر کی تقریر سُنی ہے۔ اس نے کبھی "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ نہیں لگایا۔ پھر بھی انقلاب خود نانی کو ڈھونڈتا ڈھانڈتا پونا کی تنگ گلیوں میں سے ہوتا ہوا نانی کے گھر آن پہنچا۔

ہوا یہ کہ نانی کے نواسوں میں سے ایک لڑکا ۱۹۴۲ء کی انقلابی تحریک میں پونا کے نوجوانوں کے ساتھ شامل ہوگیا۔ پھر کیا تھا نانی کا چھوٹا سا گھر جس میں صدیوں سے سوائے بھگوان کے بھجن کے اور کوئی صدا سنائی نہ دی تھی۔ اب نوجوان "انڈر گراؤنڈ" انقلابیوں کی سازشی کھسر پھسر سے گونج اٹھا۔ نئے نئے الفاظ نانی کے کانوں میں پڑنے لگے۔ نئے الفاظ اور نئے خیالات، آزادی، انقلاب، اناردلن، سامراج، سوراج، لوک راج۔

نانی کا گھر ایک تنگ گلی میں تھا اس لئے سازشی کارروائیوں کے لئے نہایت مناسب تھا۔ کتنے ہی "انڈر گراؤنڈ" انقلابی وہاں آکر ٹھہرنے لگے۔ نئی صورتیں۔ جن کے کوئی نام نہیں تھے، کوئی ذات نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ سب انقلابی برادری میں تھے۔ رات کو اندھیرے میں آتے اور سویرے سورج نکلنے سے پہلے چلے جاتے۔ دو چار پولس سے بچنے کے لئے اوپر کے کمرے میں کئی کئی دن بند رہتے۔ نانی ان کی سیوا بھی اسی طرح کرتی جیسے اپنے نواسوں کی۔ ان کے لئے چائے بنانی، کھانا پکاتی۔ سونے کے لئے بستر دیتی اور ہر روز پوجا کے بعد ان کی خیریت کے لئے پرارتھنا کرتی۔ کیوں کہ نانی کے ان پڑھ دماغ میں بھی یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ یہ نوجوان اپنی جان کو ہتھیلی پر لئے ہوئے دیش کو آزاد کرانے کے لئے جدو جہد کر رہے ہیں۔

نانی ان پڑھ ہے مگر بے وقوف نہیں۔ وہ بولتی کم ہے مگر سنتی سب کچھ ہے اور سوچتی بہت ہے۔ جلد ہی اسے معلوم ہوگیا کہ اس کے نواسے کے

ساتھیوں میں سب برہمن ہی نہیں ہیں۔ نیچ جاتیوں والے بھی ہیں۔ شودر بھی ہیں اور نو اور مسلمان بھی ہیں۔ مگر نہ جانے کیوں نانی نے ان سے کوئی چھوت چھات نہ برتی۔ چائے دیتے وقت یہ پوچھنا ضروری نہ سمجھا کہ پیالی کسی برہمن کے ہونٹوں کو لگے گی یا شودر کے یا مسلمان "ملیچھ" کے۔ نہ جانے نانی کو کیا ہوگیا تھا کہ وہ منو مہاراج کے قاعدے قانون کو اس بے باکی سے توڑنے پر تیار ہوگئی تھی؟ جب سب لڑکے سو جاتے تو نانی رات بھر کھڑکی کے پاس کان لگائے چوکنی بیٹھی رہتی کہ پولیس کی ذرا سی بھی آہٹ ہو تو انھیں ہوشیار کر دے۔

اور ایک دن پولیس آن ہی پہنچی۔ آدھی رات کے بعد اندھیرے میں موقع دیکھ کر۔ سب سو رہے تھے۔ مگر نانی جاگ رہی تھی۔ باہر سڑک پر پولیس کی لاری رکنے کی آواز سنتے ہی اس نے اپنے نواسے اور اس کے سب ساتھیوں کو جگا دیا اس سے پہلے کہ پولیس گھر میں داخل ہوسکے وہ سب برابر کے گھر کی چھت پر پھاند گئے اور وہاں سے چھتوں چھتوں ہوتے ہوئے خطرے کے علاقے سے نکل گئے۔ جب پولیس نے گھر کی تلاشی لی تو وہاں سوائے ایک بڑھی پوپلی، نیم اندھی نانی کے اور کسی کو نہ پایا۔ مگر فرش پر ابھی تک کئی کمبل بچھے ہوئے تھے۔ پولیس والے نانی کو تھانے لے گئے۔ بڑھاپے میں اسے یہ ذلت بھی سہنی پڑی۔ وہاں اس سے گھنٹوں سوال کیے گئے۔ تمھارے گھر میں کون ٹھہرا ہوا تھا؟ وہ کیا باتیں کرتے تھے؟ تمھارا نواسا کہاں ہے؟ اس کے ساتھی کون ہیں؟ مگر نانی نے ہر سوال کا جواب بڑے معصومانہ انداز میں یہی دیا کہ "مجھے نہیں معلوم ـــــ میں ان پڑھ بڑھیا یہ باتیں کیا جانوں"۔

تنگ آکر پولس نے نانی کو چھوڑ دیا۔ مگر نانی کی زبان سے ایک لفظ نہیں نکلا جس سے انقلابیوں کا پتہ چل سکے۔

نانی کی پوجا پاٹ اب بھی جاری ہے مگر اب وہ چھوت چھات نہیں برتتی۔ پچھلے برس جب اس کے .... اس نواسے کا بیاہ ہوا تو اور اس میں شریک ہونے کے لئے اس کے کئی مسلمان دوست بھی آئے اس کے مکان میں ٹھہرے۔ اور شادی کی رسومات میں شریک ہوئے۔ تو کئی کٹر عقائد کے رشتے داروں نے شادی میں شریک ہونے سے صاف انکار کر دیا۔ نانی پر بھی زور ڈالا گیا کہ وہ اپنی بزرگی کے زور سے نواسے کو مجبور کرے کہ ملیچھوں کو اپنی شادی میں شریک نہ کرے۔ مگر نانی نے ان کی کہی ان سنی کر دی اور بیاہ کے اگلے دن سویرے میں نے دیکھا کہ نانی بیٹھی میری بیوی کو چائے پلا رہی ہے اور اپنی نواسی کی ترجمانی کے ذریعے باتیں کر رہی ہے۔ ویسی ہی باتیں اور بالکل اسی طرح جیسے میری نانی کیا کرتی تھیں۔

اور اس دن سے میں اکثر سوچتا ہوں کہ جب ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ لکھی جائے گی تو کیا اس میں اس گمنام نانی کا نام بھی ہوگا جس نے آزادی اور انقلاب کے لئے اپنے صدیوں پرانے اصولوں اور تعصب کو تیاگ دیا۔ اور پھر میں سوچتا ہوں کہ اس دُبلی، سوکھی، پوپلی بوڑھی عورت میں وہ کون سی طاقت ہے کہ وہ منوہاراج کا مقابلہ کرنے سے بھی نہیں ڈرتی۔ .... کیا اس لئے کہ وہ "بھارت ماتا" اور بھارت ماتا منوسمرتی سے کہیں زیادہ اٹل اور امر ہے۔

ہندوستان ہمارا

ہم شمال میں رہنے والے جنوبی ہندوستان کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں رکھتے ہیں مثلاً یہ کہ سارے جنوبی ہندوستان میں "مدراسی" بستے ہیں جو "مدراسی" زبان بولتے ہیں اور وہ سب اتنی سختی سے چھوت چھات برتتے ہیں کہ شودر کا سایہ بھی کسی برہمن پر پڑ جائے تو شودر کو پیٹا جاتا ہے اور برہمن کو فوراً اشنان کرنا پڑتا ہے۔

اب میری حیرت کی انتہا کا خیال کیجیے، کہ جب میں اور میری بیوی، مدراس پہنچے اور میرے ایک نوجوان دوست نے ملتے ہی مجھ سے کہا کہ "آپ کھانا ہمارے یہاں کھا رہے ہیں"۔ میں جانتا تھا کہ ہمارا دوست برہمن ہوتے ہوئے بھی ذات پات کا قائل نہیں ہے۔ مگر اس کے ماں باپ، خصوصاً اس کی ماں، کیا وہ یہ گوارا کریں گی کہ دو ملیچھ ان کے ہاں کھانا کھائیں، پھر ہم نے سوچا کہ شاید ہمیں چوکے کے باہر الگ بٹھا کر کھانا کھلایا جائے گا۔ یہ سب سوچتے ہوئے، ہم ان کے گھر پہنچے۔ گھر میں صرف میرے دوست کی دو بہنیں تھیں اور اس کی ماں۔ میری بیوی اس خیال سے بھی اور گھبرائی ہوئی تھی کہ ان کٹر "مدراسی" برہمنوں کے ہاں نہ جانے کس قسم کا سلوک ہو، مگر وہاں پہنچتے ہی ہمارا استقبال اتنی گرمجوشی سے ہوا کہ ہم اپنے تمام شکوک اور شبہوں کو بھول گئے۔

ہم دس دن، مدراس میں ٹھہرے اور ہر روز دونوں وقت کا کھانا اسی

برہمن گھرانے میں کھاتے رہے۔ یہ کوئی یورپ زدہ گھرانا نہ تھا، جہاں میز کرسی پر کھانا کھایا جاتا ہو۔ زمین پر بیٹھ کر کیلے کے پتوں یا پیتل کی تھالیوں میں کھانا کھاتے تھے۔ مگر اس تمام عرصے میں ہم سے کسی قسم کی چھوت چھات نہ کی گئی۔ ہم چوکے رسوئی جہاں چاہے جا سکتے تھے۔ میرے دوست کی ماں نے میری بیوی کو گویا اپنی بیٹی بنا لیا اور بہت جلد ہم اس طرح گھل مل گئے، کہ اسی خاندان کے فرد معلوم ہونے لگے۔

اس برہمن گھرانے میں یہ روشن خیالی اور رواداری کہاں سے آئی۔ یہ سچ ہے کہ میرے دوست کے باپ گاندھی جی کے پرانے ساتھیوں میں ہیں۔ بیس برس ہوئے انھوں نے کئی ہزار کی نوکری چھوڑ کر گاندھی جی کے ساتھ سماج سدھار کا کام کرنا منظور کیا تھا۔ جب سے یہ خاندان سب قومی تحریکوں میں پیش پیش رہا ہے۔ مگر ان کی وسیع القلبی صرف سیاسی اعتقادات پر مبنی نہ تھی۔ یہ لوگ پچھلے تیس برس میں دہلی، کلکتے، جمشید پور، الٰہ آباد، وردھا، الموڑہ، بمبئی اور نہ جانے کہاں کہاں رہے تھے۔ ان کی مادری زبان تامل ہے مگر میرے دوست کی ماں بچپن میں مالابار رہی تھیں۔ اس لئے سب نے ملیالم بول لیتی ہے۔ مدتوں یو۔پی میں رہنے کی وجہ سے سب گھر والے صاف ہندوستانی بولتے ہیں اور بنگالی تو بنگالیوں کی طرح بولتے ہیں۔ ایک لڑکی کی شادی ایک بنگالی فلم ڈائرکٹر سے ہوئی ہے۔ دوسری کی شادی ایک بنگالی جرنلسٹ سے۔ نواسے جو بمبئی میں رہتے ہیں وہ تامل، بنگالی، ہندوستانی، گجراتی، مرہٹی اور انگریزی چھے زبانوں کی کھچڑی بولتے ہیں اور گھر میں کھانا تو بیچ میل پکتا ہی ہے۔ یہ گھرانا بیچ بیچ دعویٰ کر سکتا ہے کہ.....

"ہندی ہیں ہم وطن ہیں ہندوستاں ہمارا"

اس گھرانے کی سب سے دلچسپ اور اہم فرد ان کی ماں ہیں۔ یہ خاتون جو کسی زمانے میں ازحد حسین رہی ہوں گی۔ اب سے تیس برس پہلے کالج تک کی تعلیم حاصل کر چکی ہیں۔ انگریزی بولتی ہی نہیں لکھ پڑھ سکتی ہیں۔ تامل میں مضمون نگاری اور شاعری کرتی ہیں۔ اپنے سب لڑکے لڑکیوں کو انھوں نے اعلی تعلیم دلوائی ہے۔ کسی زمانے میں ان کے شوہر کی تنخواہ اٹھارہ سو روپے ماہوار تھی۔ وہ شاندار بنگلے میں رہتی تھیں۔ فرسٹ کلاس میں سفر کیا کرتی تھیں۔ اب صرف ایک کمرے میں سارے خاندان سمیت رہتی ہیں۔ کھدر کی ساڑھی اور ٹوٹے ہوئے چپل پہنتی ہیں۔ کھانا اپنے ہاتھ سے پکاتی ہیں۔ اور سب بچوں اور ان کے مہمانوں کو کھلاتی ہیں۔ جھاڑو خود لگاتی ہیں۔ مگر انھوں نے گرہستی کے کاموں میں پڑکر اپنے دماغ کی کھڑکیوں کو بند نہیں کر لیا۔ انگریزی، تامل اور ہندی کی کتابیں اور رسائل برابر پڑھتی ہیں۔ ملکی اور غیر ملکی سیاست پر رائے رکھتی ہیں اور بحث کر سکتی ہیں۔ سیاسی اور ادبی جلسوں میں شرکت کرتی ہیں۔ کلا اور سنگست کی شوقین ہیں۔ اپنی دونوں بیٹیوں کو انھوں نے گانے اور ناچنے کی تعلیم دلوائی ہے۔ فلم دیکھتی ہیں اور ان پر کڑی تنقید بھی کرتی ہیں۔ انھوں نے اور ان کے شوہر نے آرام اور عیش کی زندگی کو قوم کی خاطر تیاگ دیا۔ مگر ان کے کیرکٹر میں وہ روکھا پن اور کڑواپن ذرا بھی نہیں جو اکثر دیش بھگتوں کے کیرکٹر میں ملتا ہے۔ جیسے وہ اپنی قربانی اور تیاگ کا اعلان کر رہے ہوں۔ وہ، ان کے شوہر، ان کا بیٹا،

سب جیل جا چکے ہیں۔ مگر وہ اپنی جیل یاترا کا ڈنکا نہیں پیٹتیں۔ تنگی اور غریبی میں گزارا کرنے کے باوجود وہ ہنس مکھ ہیں۔ اکثر ہنستی اور مذاق کرتی رہتی ہیں۔ اور زندگی کے ہر شعبے میں دلچسپی لیتی ہیں۔ ساٹھ کے قریب عمر ہونے کو آئی۔ بال تقریباً سفید ہو گئے ہیں۔ اور چہرے پر جھریاں پڑتی جا رہی ہیں۔ مگر ان کا دل اب بھی جوان ہے۔ زمانہ اب تک ان کے چہرے سے وہ معصوم مسکراہٹ نہیں مٹا سکا جو جوانی میں ان کی حسین ترین خصوصیت تھی۔

مجھے یاد ہے کہ ایک دوپہر کو ہم سب ان کے کمرے کے فرش پر لیٹے سو رہے تھے۔ گرمی کے دن تھے۔ میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ وہ عینک لگائے تامل کی ایک کتاب پڑھ رہی ہیں۔ اور ساتھ ساتھ ہمیں پنکھا بھی جھلتی جا رہی ہیں، خود ان کے چہرے پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ ان کا دماغ کتاب میں تھا اور دل اپنے بچوں میں۔ انھیں اپنی کوئی پرواہ نہ تھی۔ میں نے سوچا کہ ابھی تھوڑی دیر میں یہ اٹھیں گی اور کتاب رکھ کر ہمارے لئے چائے بنائیں گی، پھر بچوں کو نہلائیں گی۔ اور مجھے بڑا اچنبھا ہوا کہ یہ کیسے اتنا کام کرتی ہیں پھر بھی ان کے ماتھے پر ذرا بل نہیں آتا۔ کیسے یہ ایک بار امیری کی زندگی بسر کرنے کے بعد اس غریبی کے جیون کو اتنی ہنسی خوشی نباہ رہی ہیں۔ کیسے یہ ایک وقت کتاب بھی پڑھ سکتی ہیں اور پنکھا بھی جھل سکتی ہیں۔ روٹیاں بھی پکا سکتی ہیں اور سیاست پر بحث بھی کر سکتی ہیں۔

اور پھر مجھے خیال آیا کہ یہ تو بھارت ماتا کا نیا اور دلکش روپ ہے۔

جس کے ایک ہاتھ میں کتاب ہے اور دوسرے میں پنکھا۔ جس کے بالوں میں گلاب کے پھول ہیں اور پیروں پر کام کاج کی دھول۔ جس کی آنکھوں میں بنگال کا جادو ہے اور ہونٹوں میں مالابار کی مسکراہٹ۔ جس کے بدن میں راجستھان کا لوچ ہے، اور پنجاب کی توانائی۔ جس کے چہرے پر بڑھاپے کی سنجیدگی ہے اور دل میں جوانی کی ہمت اور شرارت۔

شرنارتھی

اگست ستمبر ۱۹۴۷ء کے طوفان نے ایک کروڑ انسانوں کو سوکھے پتوں کی طرح گرا کر کہیں سے کہیں جا گرایا۔ پشاور والے بمبئی، دہلی والے کراچی اور لائلپور والے پانی پت پہنچ گئے۔ عمر بھر کے ساتھی اور دوست اور پڑوسی جدا ہو گئے۔ قدیم خاندانوں کا شیرازہ بکھر گیا۔ بھائی بھائی سے الگ ہو گیا۔ گھر والے بے گھر ہو گئے۔ رئیس کنگال ہو گئے۔ چاردیواریوں میں پلی ہوئی جوانیاں بکنے کے لئے بازاروں میں آگئیں۔

اس طوفان نے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں دو بوڑھی عورتوں کو ان کے اپنے اپنے قدیم وطن سے اٹھا کر ہزاروں میل دور بمبئی لا پھینکا۔ ان میں سے ایک میری ماں تھیں اور دوسری میرے ایک سکھ دوست کی ماں۔ ایک مشرقی پنجاب سے آئیں۔ دوسری مغربی پنجاب سے۔ ایک پانی پت سے آئیں۔ دوسری راولپنڈی سے۔ دونوں شاید ایک ہی دن بمبئی پہنچیں۔ میری اماں راتوں رات ملٹری ٹرک میں دہلی آئیں اور وہاں تین ہفتے

تک ایک کمرے میں، جس میں کئی عزیزوں کے خاندان پناہ گزیں تھے، ٹھیرنے کے بعد بیٹوں، نواسوں، نواسیوں کو لے کر ہوائی جہاز سے بمبئی آئیں۔ کیونکہ ان دنوں مسلمانوں کا ریل سے سفر کرنا خطرناک تھا۔ میرے دوست کی ماں بڑی مصیبتیں جھیلنے کے بعد مغربی پنجاب کے قتل عام میں سے گزرتی ہوئی راولپنڈی سے امرتسر پہنچیں۔ امرتسر سے دہلی، اور آخر کار بوڑھے شوہر کے ساتھ ریل سے بمبئی پہنچیں۔

میں اپنی ماں کو "اماں" کہتا تھا۔ میرا سکھ دوست اپنی ماں کو "ماں جی" کہتا ہے۔ جب وہ دونوں یہاں آئیں تو مجھے معلوم ہوا کہ ان دونوں میں بس یہی ایک فرق تھا۔

"ماں جی" راولپنڈی میں اپنے مکان میں رہتی تھیں، اور یہ لوگ خود رہتے تھے نیچے دوکانیں تھیں جو کرائے پر چڑھی ہوئی تھیں۔ کرائے دار زیادہ تر مسلمان تھے۔ سارا محلہ ہی مسلمانوں کا تھا۔ سردار جی اور "ماں جی" پڑوسیوں میں از حد مقبول تھے۔ سب سے خاندانی مراسم بچپن سے چلے آرہے تھے، شادی اور غم میں ایک دوسرے کے شریک ہوتے تھے۔ محلہ بھر کی مسلمان عورتیں سردارنی کو "بہن جی" کہتی تھیں اور لڑکیاں "ماں جی" یا کاکی کہہ کر پکارتی تھیں۔

راولپنڈی، ماں جی کی دنیا تھی۔ وہ کبھی یہاں سے باہر نہ نکلی تھیں۔ بیٹا پہلے لاہور، پھر کلکتے اور پھر بمبئی میں کام کرتا تھا۔ مگر ماں جی کے لیے یہ شہر کسی دوسری دنیا میں تھے۔ ان کا بس چلتا تو بیٹے کو کہیں نہ جانے دیتیں اور

اپنے پاس راولپنڈی میں رکھتیں۔ وہ اکثر سوچتیں "بھلا روپے کمانے سے کیا فائدہ
جب وہاں اسے کھانے کو نہ اصلی گھی ملتا ہے اور نہ پینے کو خالص دودھ، نہ خوبانیاں
نہ نگوگوشے، نہ سیب نہ انگور۔ گھر میں بھینس تھی۔ دس سیر پکا دودھ دیتی تھی۔ دہی
بلو کر مکھن نکالنے کے بعد چھاچھ سارے محلے میں تقسیم ہوتی اور سب سردارنی
کو دُعائیں دیتے مگر وہ خود اپنے بیٹے کو یاد کر کے غمزدہ ہو جاتیں کہ نہ جانے
اسے بمبئی میں ڈھنگ کا کھانا بھی نصیب ہے یا نہیں۔

راولپنڈی کے پاس ہی ان کی موروثی زمین بھی تھی فصل پر کھیتوں سے
کافی اناج آجاتا تھا۔ دودھ، دہی، گھی تو گھر کا تھا ہی۔ کچھ آمدنی دو دکانوں
سے ہوتی، کچھ روپیہ بیٹا بھیج دیتا۔ گزارہ اچھی طرح ہو رہا تھا۔ جب جون میں
ملک کی تقسیم اور پاکستان بننے کی خبریں چھپیں تب بھی ماں جی زرا نہ گھبرائیں۔
انھیں سیاسی جھگڑوں سے کیا کام۔ ہندوستان ہو یا پاکستان۔ ان کا
واسطہ تو اپنے پڑوسیوں سے تھا۔ سو ان سے ہمیشہ کے اچھے تعلقات چلے
آرہے تھے۔ اگلے فرقہ وارانہ جھگڑے ہوئے مگر ماں جی اور ان کے گھر والوں
پر کوئی آنچ نہ آئی۔ مگر اس بار تو بہت خوفناک آگ بھڑکی تھی۔ راولپنڈی میں
ہندوؤں اور سکھوں کی جان خطرے میں تھی۔ مگر ماں جی کو پھر بھی اطمینان تھا۔
بیٹے نے لکھا کہ فوراً بمبئی چلی آؤ۔ مگر وہ راولپنڈی چھوڑنے پر راضی نہ ہوئیں۔
ان کے بہت سے رشتے دار اور جان پہچان والے مشرقی پنجاب یا دہلی چلے گئے۔
مگر ماں جی اپنے گھر سے نہ ہلیں۔ جب بھی کوئی ان سے کہتا کہ یہاں خطرہ ہے
ہندوستان چلی جاؤ، وہ یہی جواب دیتیں کہ ہمیں کون مارے گا۔ اِس

محلے میں چاروں طرف ہمارے اپنے ہی بچے تو رہتے ہیں۔

اور پھر مشرقی پنجاب سے آئے ہوئے مسلمان پناہ گزینوں کے آنے کے بعد راولپنڈی کی حالت اتنی ابتر ہوگئی کہ ان کے مسلمان پڑوسیوں نے صلاح دی کہ آپ کسی محفوظ مقام پر چلی جائیں ورنہ یہیں آپ کی جان کا خطرہ ہے۔ اگرچہ اب بھی کئی ایسے بھی تھے جو ان سے یہی کہتے رہے کہ آپ نہ گھبرائیں ہم آپ کی حفاظت اپنی جان سے کریں گے۔ ایک مسلمان درزی جو ان کا کرایہ دار تھا اور جس کا ان کے ہاں آنا جانا تھا وہ تو بہت ہی رویا اور گڑگڑایا کہ آپ لوگ نہ جائیں۔

مشرقی پنجاب سے جو مصیبت کے مارے آئے تھے ان میں سے کچھ ماں جی کے گھر کے سامنے ٹھیرے تھے۔ ان کی ابتر حالت دیکھ کر ان سے نہ رہا گیا اور انھوں نے ان کو اپنے گھر سے برتن، بچھونے اور اوڑھنے کے لیے کمبل بھجوائے۔ ان کے دل میں یہ خیال بھی نہ آیا کہ یہ مسلمان ہیں سکھوں کے دشمن ہیں ان کی مدد نہ کرنی چاہیے اور نہ یہ خیال آیا کہ شاید چند روز بعد وہ خود بھی اسی حالت میں ہوں گی!

ان ہی دنوں ان کے سامنے سڑک پر چند مفسدوں نے ایک ہندو تانگے والے کو چھرا مار کر مار ڈالا۔ میں نے یہ واقعہ "ماں جی" کی زبان سے سنا ہے: "بیٹا، تانگے والا تو پھر بھی ہندو تھا۔ پر گھوڑے کا تو نہ کوئی دھرم ہوتا ہے نہ جات پات۔ پر انھوں نے اس بے چارے بے زبان جانور کو بھی نہ چھوڑا ـــــ چھرے بھونک کر اسے بھی مار ڈالا۔ ایسا لگتا

تھا جیسے ان کے سروں پر خون سوار ہو، جیسے وہ اب انسان نہ رہے ہوں، کچھ اور ہو گئے ہوں۔" اور اس کے بعد "ماں جی" کو بھی فیصلہ کرنا پڑا۔ کہ اب ان کا اور ان کے گھر والوں کا وہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔

سو وہ راولپنڈی کا مکان اور اس میں اپنا سامان چھوڑ کر چلی آئیں۔ صرف "تالا لگا کر۔ یہ سوچتی ہوئی کہ ہمیشہ کے لئے تھوڑا ہی جا رہی ہوں۔ یہ جنون یہ پاگل پن کبھی تو ختم ہوگا تب چلے جائیں گے۔ مگر دہلی پہنچتے پہنچتے ان کی بوڑھی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا کہ راولپنڈی جانے کا خیال ناممکن ہو گیا۔ جب تک وہ بمبئی پہنچیں۔ راولپنڈی ان کے دل میں ایک کسک بن کر رہ گیا تھا۔

راولپنڈی میں وہ چھ بڑے بڑے کمروں والے مکان میں رہتی تھیں۔ بمبئی میں وہ اور ان کے شوہر اپنے بیٹے کے پاس رہتے ہیں۔ تینوں ایک چھوٹے سے کوٹھری نما کمرے میں۔ جس کے ایک طرف دھوبی رہتا ہے۔ دوسری طرف کوئلے کی دوکان ہے۔ نیچے ایک چھوٹی سی کوٹھری ہے۔ جو بیک وقت رسوئی، غسل خانہ اور اسٹور روم کا کام دیتی ہے۔ جب میرا دوست یہاں اکیلا رہتا تھا۔ یہی کمرہ ایک کباڑ خانہ لگتا تھا۔ جہاں پرانے اخباروں، بے دُھلے برتنوں اور میلے کپڑوں کے ڈھیر ہر جگہ لگے رہتے تھے۔ مگر اب آپ وہاں جائیے تو اتنی تنگ جگہ میں بھی ہر چیز صاف ستھری اور قرینے سے لگی ہوئی ملے گی۔ پلنگوں پر سفید چادریں لگی ہوئی۔ فرش صاف شفاف۔ کیا مجال ہے کہ کہیں مٹی یا گرد کا ایک ذرہ بھی نظر آجائے۔ اپنے بیٹے اور شوہر کے لئے ماں جی اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتی ہیں اور کیا مجال ہے

کہ کوئی ملنے آئے اور وہ کچھ کھائے پیئے بغیر وہاں سے چلا جائے۔ ماں جی کا گھر چھوٹ گیا ہے۔ سامان لُٹ گیا ہے۔ زمیندار اور گھروالی سے وہ شرنارتھی ہوگئی ہیں۔ مگر ان کی مہمان نوازی نہیں گئی۔

ماں جی کا رنگ گورا ہے۔ قد چھوٹا سا۔ بال پہلے کھچڑی تھے اب راولپنڈی سے آنے کے بعد سفید ہوگئے ہیں۔ اکثر بیمار بھی رہتی ہیں مگر کبھی بیکار نہیں بیٹھتیں۔ کوئی نہ کوئی کام کرتی ہی رہتی ہیں۔ بیٹے کے لئے کھانا پکانا ہو یا شوہر کے کپڑوں میں پیوند لگانا ہو یا کسی مہمان کے لئے لسی یا چائے بنانا ہو، ہر کام اپنے ہاتھ سے کرتی ہیں۔ ان کو دیکھ کر آپ کبھی یہ خیال نہ کریں گے کہ وہ کتنی مصیبتیں جھیلی ہوئی شرنارتھی ہیں۔ کبھی ان مسلمانوں کو بھی برا نہیں کہتیں جن کی وجہ سے انھیں بے گھر ہونا پڑا اور اپنے مسلمان پڑوسیوں کا ذکر اب بھی بڑی محبت سے کرتی ہیں اور اب بھی کبھی کبھی انھیں خط لکھواتی رہتی ہیں اور ان کے خط آنے پر از حد خوش ہوتی ہیں۔ جب وہ میری اماں سے پہلی بار ملیں تو دونوں ایک دم بغل گیر ہوگئیں اور کچھ کہنے سننے سے پہلے دونوں کئی منٹ تک خاموشی سے اپنے اپنے وطن کو یاد کرتے ہوئے روتی رہیں اور پھر ایک دوسرے کو اس طرح تسلّی دیتی رہیں جیسے کہ دونوں سگی بہنیں ہوں۔ ان دو عورتوں ایک سکھ اور ایک مسلمان کو۔۔یوں باتیں کرتے اور ایک دوسرے کے دُکھ درد پر رونے دیکھ کر مجھے ایسا لگا کہ مسلمانوں اور سکھوں کی نفرت ان کے آنسوؤں سے دھل رہی ہے۔

ویسے "ماں جی" کبھی اپنے نقصان اور غم کا اعلان نہیں کرتیں ـــــ

ہاں کبھی کبھی ایک ہلکی سی ٹھنڈی سانس لیتی ہیں اور کہتی ہیں کہ "بیٹا، تمہارا بمبئی لاکھ بڑا شہر ہو مگر ہم تو کبھی راولپنڈی کو نہیں بھول سکتے۔ وہ خوبانیاں..... وہ بگوگوشے .... اور پھر وہ خاموش ہو جاتی ہیں۔ اور ان کی دھنسی ہوئی دھندلی دھندلی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا جاتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اس شرنارتھی "بھارت ماتا" کے دل میں نفرت اور غصے کے لئے کوئی جگہ ہی نہیں ہے۔ صرف ماضی کی یادیں ہیں جو اس کے چھوٹے ہوئے وطن سے وابستہ ہیں........ وہ یادیں جو بگوگوشوں کی طرح ملائم اور نازک ہیں۔ اور خوبانیوں کی طرح خوشبودار..........

نفرت کی موت

ہر ایک کے لئے اس کی اپنی ماں سب سے اہم اور سب سے پیاری ہستی ہوتی ہے۔ اس لئے اس فہرست میں اگر میں اپنی مرحومہ ماں کا نام بھی شامل کر دوں تو کوئی تعجب نہ ہونا چاہئے۔ میرے خیال میں میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو اس سلسلے میں وہ اپنی ماں کا ذکر ضرور کرتا اور کرنا بھی چاہئے۔ اس لئے کہ سب سے پہلے اپنی ماں کے چہرے ہی میں تو ہم بھارت ماتا کی شان دیکھتے ہیں۔ اور ہم میں سے ہر ایک کے لئے بھارت ماتا کے جتنے مختلف روپ ہیں ان میں سب سے پیارا اور سب سے جانا پہچانا روپ اپنی ماں کا ہوتا ہے۔

جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے کہنا پڑتا ہے کہ ان کی زندگی کے صرف آخری دنوں میں مجھے اپنی اماں کے کیریکٹر کی مضبوطی، ان کی انسان دوستی اور

رواداری کا پورا احساس ہوا۔ اس وقت تک وہ صرف میری ماں تھیں مگر ۱۹۴۷ء کے ہولناک واقعات کے پسِ منظر میں مجھے پہلی بار اپنی ماں میں بھارت ماتا کی شان نظر آئی۔

جب مغربی پنجاب کے زخم خوردہ ہندو سکھ شرنارتھیوں کے آنے کے بعد پانی پت میں مسلمانوں کا رہنا مشکل ہو گیا اور وہ سب پاکستان "ہجرت" کی تیاری کرنے لگے تو میری ماں پر بھی دوسرے عزیز رشتے داروں نے دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ ان کے ساتھ پاکستان چلیں اور مجھے بھی لکھیں کہ میں بمبئی سے کراچی آجاؤں مگر انھوں نے صاف انکار کر دیا، اور کہا کہ "ہم اپنا وطن نہ چھوڑیں گے۔ میرے بیٹے نے ہندوستان رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس فیصلے میں میں اس کے ساتھ ہوں"۔ فسادات کے تیس بالیس دن انھوں نے پانی پت ہی میں گزارے۔ سات سات دن کا کرفیو لگتا۔ گھر میں روٹی اور چٹنی کھا کر گزارہ کرنا پڑتا۔ کئی کئی دن بچوں کو دودھ نہ ملتا اور پان جو میری اماں کی زندگی کا ایک ضروری جزو تھا ایک روپے میں ایک پتہ نصیب ہوتا۔ جس کے دس چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے دن بھر چلایا جاتا۔ خاندان کا کوئی مرد اس وقت پانی پت میں موجود نہیں تھا۔ میں بمبئی تھا اور میرے ایک چچیرے بھائی پونا میں اور ایک دہلی میں۔ مگر ان دنوں دہلی سے پانی پت تک پچاس میل کا سفر کرنا بھی مشکل تھا۔ پانی پت میں ہمارے خاندان کی ذمہ داری میری اماں پر تھی۔ خط اور تار بھی آجا نہ سکتے تھے۔ نہ انھیں ہماری خبر تھی نہ ہمیں ان کی۔ اس کے باوجود اماں اپنے ہندوستان

میں رہنے کے فیصلے پر اٹل رہیں۔

پھر ہمارے ان رشتے داروں کو نکالنے کے لئے جنھوں نے ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ دہلی سے ایک ملٹری ٹرک راتوں رات پانی پت بھیجا گیا۔ گھنٹے بھر کی مہلت سامان باندھنے کی ملی۔ جو کچھ برقعہ پوش عورتیں خود اٹھا سکتی تھیں اتنا سامان ہمراہ لے کر چل پڑیں۔ گر چلتے وقت میری اماں کو یہ احساس بالکل نہیں تھا کہ وہ اپنے وطن اور اپنے گھر کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ رہی ہیں۔ بلکہ یقین تھا کہ حالات بہتر ہوتے ہی وہ پھر پانی پت واپس آجائیں گی۔ اس لئے انھوں نے دروازے میں تالا ڈالا اور ایک بورڈ لگوا دیا کہ "اس گھر کے رہنے والے پاکستان نہیں جا رہے ہیں اپنے عزیزوں کے پاس بمبئی جا رہے ہیں اور ہندوستان ہی میں رہیں گے۔"

بیس دن وہ سب دہلی میں رہے بیس آدمی ایک کمرے میں بند۔ کیونکہ ہوائی جہاز کے اڈے تک پہنچنا بھی مشکل تھا ریل کے راستے تو تقریباً بند ہی تھے۔ اس عرصے میں یہ خبر بھی آگئی کہ پانی پت میں ہمارے مکان لٹ گئے ہیں اور شرنارتھیوں نے ان پر قبضہ کر لیا ہے۔

جان کے خوف، کئی کئی دن کے فاقوں اور ایک کمرے میں بند رہنے کی وجہ سے سب کے رنگ پیلے پڑ گئے تھے بچوں کے بدن بالکل سوکھ گئے آخر کار ہوائی جہاز کا راستہ کھلا اور عمر میں پہلی بار میری اماں نے بغیر برقعے کے سفر کیا۔ جس دن وہ بمبئی آنے والی تھیں اس سے پہلی رات میں نے جاگتے گزاری۔ یہ سوچتے ہوئے کہ ان سب واقعات سے نہ جانے میری ماں

کی طبیعت پر کیا اثر کیا ہوگا۔ کیا وہ بھی نفرت، غصے اور فرقہ پرستی کے اس سیلاب میں بہہ گئی ہوں گی؟ جو اس وقت سارے ہندوستان اور پاکستان میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ کیا ان کی ہمیشہ کی انسان دوستی، رحمدلی، رواداری اور انصاف پرستی اس خونیں سمندر میں ڈوب گئی ہوگی؟ کیا ان کی زندہ دلی اور بشاش طبیعت پر ہمیشہ کے لئے غم اور یاس کے بادل چھا گئے ہوں گے؟ میں اپنی ماں کی صحت کی حالت سے بخوبی واقف تھا۔ پندرہ بیس برس سے وہ دمہ کی مریض تھیں۔ اختلاجِ قلب عمر بھر کا ساتھی تھا ـــــــــــ شوہر اور جوان بیٹی کی اچانک موت سے انھیں ناقابلِ برداشت صدمہ پہنچایا تھا۔ کمزور اتنی ہوگئی تھیں کہ ساٹھ برس کی عمر میں اسی کی معلوم ہوتی تھیں۔ بے سہارے دو قدم چلنا مشکل تھا۔ کیا وہ ان تمام مصائب کو جھیل کر زندہ رہ سکیں گی؟ اور اگر زندہ رہیں بھی تو کیا وہ زندگی میں کوئی دلچسپی لے سکیں گی؟ نہ جانے ہوائی جہاز کے سفر کا ان کی صحت پر کیا اثر پڑے۔

جب تک ہوائی زمین پر اترا میرے دماغ کو یہی سوالات پریشان کرتے رہے اور پھر میں نے دیکھا کہ بے برقعہ ایک چادر میں منہ چھپائے ہوئے وہ ہوائی جہاز سے اتر رہی ہیں۔ اپنی بیٹی کا سہارا لئے ہوئے۔ اور یہ سوچ کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے کہ وہ جو پردے کی اتنی شدت سے پابند تھیں اور جنھوں نے اس مسئلہ پر مجھ سے کتنی سخت کشتی کی تھیں، آج اپنی جان بچانے کے لئے برقعہ ترک کرنے پر مجبور ہوگئی تھیں۔ میں نے کوشش کی تھی کہ وہ برقعہ پہننا چھوڑ دیں۔ مگر اس وقت انھیں بغیر برقعہ آتے

دیکھ کر مجھے قطعی خوشی نہیں ہوئی۔ بلکہ میں ڈرا کہ شاید اس مجبوری کی وجہ سے ان کی طبیعت اور مزاج میں شدید تلخی اور کڑواپن آگیا ہو اور وہ اس زندگی اور انسانیت پر لعنت بھیجنے لگی ہوں۔ جس نے انھیں اپنے غلط مگر عزیز اصول چھوڑنے پر مجبور کیا تھا۔

یہی سوچتے ہوئے میں انھیں سہارا دے کر موٹر تک لے گیا۔ چند منٹ تک سانس کی تکلیف کی وجہ سے وہ بول نہ سکیں۔ پھر سانس کو قابو میں کرتے ہوئے انھوں نے مجھ سے پہلے الفاظ جو کہے وہ سننے کے لئے میں بالکل تیار نہ تھا۔ انھوں نے کہا "بھئی میں تو اب ہمیشہ ہوائی جہاز میں سفر کیا کروں گی۔ بڑے آرام کی سواری ہے"۔

اور اس رات پانی پت اور دہلی کے حالات سناتے ہوئے انھوں نے میرے دوسرے شبہات کو بھی ختم کر دیا۔ کہنے لگیں "نہ یہ اچھے نہ وہ اچھے۔ نہ مسلمانوں نے کسر اٹھا رکھی نہ ہندوؤں اور سکھوں نے۔ سب کے سروں پر خون سوار ہے۔ مگر مسلمان ہونے کی حیثیت میں میں مسلمانوں کو زیادہ الزام دوں گی کہ انھوں نے اپنی حرکتوں سے اسلام کا نام ڈبو دیا"۔

ان دنوں بمبئی میں فسادات زور شور سے چل رہے تھے۔ میری اماں کو معلوم تھا کہ شواجی پارک جہاں ہم رہتے ہیں وہ خالص ہندو علاقہ ہے جہاں اس وقت شاید دو تین مسلمانوں کے گھر تھے۔ پھر بھی اگلے ہی دن وہ برقعہ اوڑھ، دو بچوں کی انگلی پکڑ سمندر کی سیر کرنے اور بچوں کے سیپیاں اکٹھی کرنے چل دیں۔ میں نے دبی زبان سے ــــــ روکنے کی کوشش بھی کی۔

مگر وہ نہ مانیں اور کہنے لگیں "ارے مجھے کون مارے گا؟" وہ اطمینان سے آہستہ آہستہ سمندر کے کنارے ٹہلتی رہیں اور میں کافی پریشان احاطے کی دیوار پر بیٹھا دور سے ان کی "حفاظت" کرتا رہا۔ میں بزدل نکلا اور وہ بہادر۔ اور انسانیت میں ان کا اعتقاد مجھ سے کہیں زیادہ اٹل ثابت ہوا۔

میرا ایک پنجابی شرنارتھی ہندو دوست ان دنوں میرے ہاں ٹھیرا ہوا تھا۔ یہ سن کر کہ اس کے شہر شیخوپورہ میں بہت سے ہندو مارے گئے تھے اور میرے دوست کے گھر والے راتوں رات بڑی مشکل سے جان بچا کر وہاں سے بھاگے تھے اور بہت تکلیفیں اٹھا کر ہندوستان کے کسی شرنارتھی کیمپ میں پہنچے تھے۔ میری اماں بہت دیر تک روتی رہیں۔ پھر مجھے الگ لے جا کر کہا "دیکھنا یہ لڑکا آج سے تمھارا بھائی ہے اس کا ہمیشہ خیال رکھنا۔ شاید اسی طرح ہم ان گناہوں کا کفارہ ادا کر سکیں جو ہمارے ہم مذہبوں نے کئے ہیں"......... اس زمانے میں روز نماز پڑھ کر دعا مانگتیں "یا اللہ سب بے گھر، ہندو مسلمان سکھ ـــ اپنے اپنے گھر واپس جائیں، اور سب کے صدقے میں ہمیں بھی پانی پت جانا نصیب ہو جائے"۔

جس دن گاندھی جی کی موت کی خبر آئی اس دن ہمارے گھر میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بہت ہی قریبی عزیز مر گیا ہے۔ اس رات میری اماں نے کھانا نہیں کھایا۔ اگلے دن صبح ریڈیو کے پاس بیٹھی گاندھی جی کی ارتھی کے جلوس کی کمنٹری سنتی رہیں اور چپکے چپکے روتی رہیں۔ بار بار ٹھنڈی سانس بھر کر کہتیں "ہائے ـــ اب ہندوستان کا کیا ہوگا؟"

قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ وہ جن کو ہندوستان سے اتنی محبت تھی۔ ان کو مرنے کے بعد ہندوستان کی مٹی نصیب نہ ہوئی۔ اپنی چھوٹی بیٹی کے پاس کراچی گئیں اور وہاں ان کے پرانے مرض نے ایسی خطرناک صورت اختیار کرلی کہ جاں بر نہ ہوسکیں۔ مگر آخری دم تک وہ اپنے ملک کی اتنی ہی وفادار رہیں۔ انھیں معلوم تھا کہ ان کا بیٹا اپنے سیاسی اصولوں کی بنا پر اس زمانے کی فضا میں پاکستان جانا پسند نہ کرے گا۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ اگر ان کی طرف سے لکھا گیا کہ میرا آخری دم ہے مرنے سے پہلے میرا منہ دیکھ جاؤ تو وہ اپنے اصولوں کے باوجود ماں کی خاطر وہاں چلا آئے گا۔ اسی لئے وہ مرتے مر گئیں، مگر کبھی ایک بار بھی مجھے وہاں آنے کے لئے نہیں لکھوایا، بلکہ سب کو تاکید کرتی رہیں کہ کوئی ایسا پریشانی کا خط نہ لکھنا کہ وہ گھبرا کر چلا آئے۔ وہ تو خود ہی ہندوستان آنا چاہتی تھیں۔ ذرا طبیعت سنبھلی تو مجھے لکھوایا کہ پرمٹ کا انتظام کرادو میں واپس آنا چاہتی ہوں۔ انتقال سے چند روز پہلے انڈین ہائی کمشنر نے انھیں "ہندوستانی شہری" تسلیم کرتے ہوئے مستقل طور پر ہندوستان آنے کی اجازت دے دی۔

مگر اپنے وطن آنے کے سپنے دیکھتے ہوئے ہی وہ اس دنیا سے کوچ کر گئیں۔

وہ کراچی کے قبرستان میں دفن ہیں۔ مگر ان کی روح ——— ان کی یاد ——— ان کی زندگی کی مثال یہیں ہندوستان میں ہمارے پاس ہے۔ پانی پت میں ان کی سب جائداد لٹ گئی مگر جو میراث انھوں نے

ہمارے لئے چھوڑی ہے وہ مکانوں ...... زمینوں، زیور، گہنوں سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔

اور پاکستان کی وہ چھ فٹ زمین ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہندوستان ہی رہے گی۔ کیونکہ اس میں ایک "بھارت ماتا" دفن ہے۔

ابراہیم ۹ ۳۹/ ۷۵۹

پریم چند کے خطوط

مصنف: مدن گوپال

صفحات: 392

قیمت:-/98 روپے

ISBN : 978-81-7587-507-4

₹ 58/-